معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰/روپے فی شمارہ ۱۲/روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس [۲۵] پونڈ یا چالیس [۴۰] ڈالر

بحری ڈاک نو [۹] پونڈ یا چودہ [۱۴] ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ، شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۶ ماہ ذی قعدہ ۱۴۲۶ھ مطابق ماہ دسمبر ۲۰۰۵ء عدد ۶

فہرست مضامین

ای میل: email: shibli_academy@rediffmail.com

شذرات

اردو کے ممتاز شاعر اور جنگ آزادی کے عظیم مجاہد مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کی شخصیت اور فن پر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونی ورسٹی کے زیر اہتمام ۱۶؍تا ۱۸؍نومبر کو ایک سمینار یونی ورسٹی کے آرٹس فیکلٹی آڈیٹوریم میں ہوا، افتتاحی جلسے کی صدارت اردو کے محقق ونقاد اور بنارس ہندو یونی ورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر حنیف نقوی نے کی اور افتتاح یونی ورسٹی کے ریکٹر پروفیسر شری کانت لے لے نے کیا، مقالات کے کئی سشن ہوئے جن میں حسرت کے شعری، ادبی اور سیاسی کارناموں کے علاوہ اصلاح زبان اور اردو تذکروں کی طبع واشاعت، ترقی پسند تحریک اور کمیونسٹ پارٹی سے ان کا تعلق، مذہبی شغف اور سیرت وشخصیت کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث وگفتگو ہوئی، پروفیسر عبدالحق (دہلی)، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید (حیدرآباد)، پروفیسر عبدالباری (ٹانڈہ)، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی (علی گڑھ)، ڈاکٹر شاہد حسین (جواہر لال یونی ورسٹی، دہلی)، ڈاکٹر علی احمد فاطمی (الہ آباد)، ڈاکٹر منظر حسین (جمشید پور) وغیرہ کے مقالوں نے سمینار کا پایہ بلند کیا، مقامی لوگوں میں جناب سلام اللہ صدیقی اور ڈاکٹر یعقوب یاور کے مقالے بھی پسند کیے گئے، بنارس یونی ورسٹی کی پروفیسر شمیم اختر، پروفیسر رفعت جمال اور شعبۂ اردو کے ڈاکٹر عبدالسلیم اور ڈاکٹر آفتاب احمد نے بھی مضامین پڑھے، راقم نے ''حسرت کی طرفہ تماشا طبیعت'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا، ۱۷؍کی شب میں پروفیسر حفیظ بنارسی کی صدارت میں کامیاب مشاعرہ ہوا، مولانا حسرت موہانی کے ادبی وشعری کارناموں سے قطع نظر ملک کی سیاست اور آزادی کی تحریک میں ان کا حصہ بالکل بھلا دیا گیا ہے، ہم ڈاکٹر نسیم احمد صدر شعبۂ اردو اور ان کے رفقائے کار کو مبارک باد دیتے ہیں کہ انہوں نے حسرت پر یہ اچھا پروگرام کیا۔

مدرسہ دینیہ غازی پور کا قیام پچھتر برس پہلے عمل میں آیا تھا، اب اس نے اپنے فعال اور مخلص مہتمم مولانا عزیز الحسن صدیقی کی سربراہی میں دینی وعصری تعلیم کے مرکز اور ایک تحریک کی شکل اختیار کرلی ہے، اس کی ۳۸ شاخیں اور ملحقہ مکاتب غازی پور اور اس کے مضافات میں پھیلے ہوئے ہیں اور دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم کے لیے پرائمری، جونیر اور نسواں اسکول بھی قائم ہوگئے ہیں

اور کئی برس سے مسلمانوں کی فکری اصلاح اور ذہن وکردار سازی کے لیے ایک موقر دو ماہی مجلہ ''تذکیر'' نکل رہا ہے، مدرسہ کی ان متنوع خدمات کے جائزے کے لیے ۲۷و۲۸؍نومبر کو اس کا ۷۵ سالہ تعلیمی جشن منایا گیا اور اسی مناسبت سے مدرسہ میں عالمی رابطہ ادب اسلامی شعبہ ممالک مشرقیہ کا ۲۳واں سالانہ سمینار ۲۵، ۲۶؍نومبر کو منعقد ہوا جس کا موضوع ''اردو زبان وادب کے ارتقا میں علما کا حصہ'' تھا، اس کے افتتاحی جلسے کی صدارت مشرقی رابطہ کے صدر مولانا سید محمد رابع ندوی نے فرمائی، ان کا خطبہ صدارت بصیرت افروز تھا، مولانا عزیز الحسن صاحب کا خطبہ استقبالیہ غازی پور کی تاریخی، علمی، تعلیمی اور دینی عظمت پر مشتمل تھا، دو روز مقالات کے جلسے ہوئے، راقم نے ''علامہ شبلی کا ادبی پایہ'' کے عنوان سے مقالہ لکھا تھا مگر ۲۵ ہی کو پٹنہ جانے کی وجہ سے اسے پڑھ نہیں سکا، جشن تعلیمی میں تعلیمی نمائش اور افتتاحی اجلاس عام کے علاوہ دو اور عام اجلاس ہوئے، مولانا عزیز الحسن صاحب کی مخلصانہ جدوجہد سے دونوں تقریبات خیر وخوبی سے انجام پائیں۔

تیسرا باوقار سمینار ''معین احسن جذبی: شخصیت اور شاعری'' پر خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ۲۶و۲۷؍نومبر کو ہوا، اس کا افتتاحی سشن پروفیسر سید احتشام الدین وائس چانسلر پٹنہ یونی ورسٹی کی صدارت میں ہوا اور افتتاح **پروفیسر محمد حسن** کے عالمانہ مقالہ سے ہوا، اس کا آغاز ڈاکٹر امتیاز احمد ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری کی خیر مقدمی تقریر سے ہوا اور اختتام مسٹر شفیع مشہدی کے شکریے پر ہوا، مقالات کے چار سشن ہوئے، پہلے کی صدارت جناب انیس رفیع کلکتہ اور نظامت ڈاکٹر اعجاز علی ارشد سکریٹری بہار اردو اکادمی نے کی اور مشتاق احمد نوری اور شمیم احمد فاروقی نے جذبی کی غزل گوئی اور ڈاکٹر اعجاز علی ارشد اور پروفیسر اسلم آزاد صدر شعبہ اردو پٹنہ یونی ورسٹی نے ان کی نظم گوئی پر مقالے پڑھے، دوسرے سشن کی صدارت بمبئی سے آئے ہوئے پروفیسر مجاہد حسین حسینی نے کی، اس میں ڈاکٹر عبدالصمد اور ڈاکٹر محسن رضا (پٹنہ) نے ''جذبی کی شاعری میں سیاسی عنصر''، ڈاکٹر رضوان احمد (پٹنہ) نے ''جذبی اور ترقی پسند تحریک'' اور راقم نے ''جذبی کا سیاسی شعور ان کی کتاب حالی کا سیاسی شعور کے حوالے سے'' مضمون پڑھے، تیسرا سشن راقم کی صدارت میں ہوا، اس میں ڈاکٹر مشتاق احمد صدف (میرٹھ)، پروفیسر علیم اللہ حالی (مگدھ یونی ورسٹی)، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید (حیدرآباد) اور پروفیسر حسینی (بمبئی) کے مقالے ہوئے، چوتھے اجلاس کی صدارت پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے

کی اور ڈاکٹر شکیب ایاز، جناب احمد یوسف، جناب شفیع مشہدی (پٹنہ) اور ایم آر قاسمی (سفینۃ الہدایۃ دہلی) کے مقالے ہوئے، پانچواں اور اختتامی جلسہ تاثراتی تھا، اس کی صدارت پروفیسر نسیم احمد(؟) شاد حسین(؟) (وائس چانسلر علی گڑھ یونی ورسٹی) اور نظامت ڈاکٹر امتیاز احمد ڈائرکٹر نے کی، مقالات پر خوب بحثیں بھی ہوئیں، ۲۷ رکی شب کے مشاعرے کا افتتاح راقم نے اور صدارت پروفیسر حسینی نے کی جو شمیم فاروقی کی نظامت اور منتخب شعرا کی شرکت سے بہت کامیاب رہا۔

مجلہ "معارف" ۱۹۱۶ء سے مسلسل بلا ناغہ شائع ہو رہا ہے گو اس کی اشاعت شروع سے زیادہ نہیں تھی اور وہ خسارے سے نکلتا ہے لیکن علم و تحقیق کا دائرہ جوں جوں ترقی کرتا اور وسیع ہوتا جارہا ہے، اتنا ہی پرانے اور نئے شماروں کی مانگ بڑھتی جارہی ہے مگر پتا نہیں لوگ اس کے خریدار بننا کیوں پسند نہیں کرتے، پہلے کاغذ اور دوسری اشیا ارزاں تھیں اور رسالہ زیادہ چھپتا تھا مگر اب غیر معمولی گرانی کی وجہ سے وہ بہ قدر ضرورت ہی شائع ہوتا ہے اور چند برسوں میں ختم ہو جاتا ہے مگر اس کے لیے آئے دن پرانے اور نئے رسالوں کی فوٹو کاپیوں کی فرمائشیں آتی رہتی ہیں جن کی تعمیل بہت دشوار ہے۔

دارالمصنفین کے کتب خانے میں معارف کی مکمل اول تا آخر صرف ایک ایک ہی جلد محفوظ ہے (۱۵-۲۰ برس سے مزید جلدیں محفوظ کرنے کا باقاعدہ اہتمام ہوا ہے) پرانے رسالوں کے کاغذ خستہ ہیں جو فوٹو کاپی کے بعد صحیح سلامت نہیں رہ سکتے، ان کی تجلید اہتمام سے پختہ اور چمڑے کی کرائی گئی ہے اور ایک جلد ۱۰۰ روپے میں تیار ہوتی ہے، عموماً لوگوں کی فرمائش دو چار صفحوں یا ایک دو مضمون کی ہوتی ہے، اس کی فوٹو کاپی سے پوری جلد خراب ہو جاتی اور ٹوٹ جاتی ہے اور ہر جلد میں چھ مہینے کے پرچے ہوتے ہیں لیکن چند صفحوں کی وجہ سے اگر کسی کا علمی و تحقیقی کام ہی رک رہا ہو تو وہ مکمل جلد کے چھ شماروں کی دو کاپیاں کرائیں، ایک دارالمصنفین کے پاس رہے گی اور دوسری صاحب معاملہ کو بھیجی جائے گی لیکن اس کے اور تجلید کے نیز پوسٹل اخراجات انہیں پہلے بھیج دینا ہوگا، اسی طرح کتابوں کے بھی دو چار صفحوں کی فوٹو کاپیاں طلب کر کے ہمیں آزمائش میں نہ ڈالیں، قلمی کتابیں ہی نہیں اکثر مطبوعہ امہات کتب بھی اب نایاب ہوگئی ہیں جن کی فوٹو کاپی مہیا کرنے سے ہم معذور ہیں۔

مقالات

علامہ شبلی نعمانیؒ کی انفرادیت اور امتیازات

از:- ڈاکٹر سید عبدالباری☆

دبستان سرسید میں علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت بے حد انوکھی اور نرالی ہے کہ اعتراضات اور نکتہ چینیوں کے باوجود اس کے حریف بھی یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ وہ اپنے معاصرین میں سب سے قد آور، سب سے پرشکوہ اور سب سے ذہین بلکہ عبقری انسان ہے جس نے ادب و تہذیب کا کوئی گوشہ ایسا نہ چھوڑا جسے چھان نہ ڈالا ہو اور علم و فکر کی کوئی وادی ایسی نہیں جہاں ان کے نقوش قدم آج تک چمک نہ رہے ہوں۔

علی گڑھ تحریک کے ایک فرد ہونے کے باوجود وہ اس تحریک کے سب سے بڑے باغی نظر آتے ہیں، زندگی کے آخری مراحل میں مسلمانوں کے قدیم نظام تعلیم کی اصلاح کا اشتیاق اور اسے جدید سانچے میں ڈھالنے اور زمانہ حاضر سے مطابقت پیدا کرنے کا شوق انہیں ندوۃ العلما سے وابستہ کرتا ہے اور اس ادارہ کی نظامت کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہیں لیکن وہاں کی تنگی داماں بھی انہیں صدائے احتجاج بلند کرنے بلکہ سراپا احتجاج بن کر ادارہ کو خیرباد کہنے پر مجبور کرتی ہے اور آخری ایام میں وہ اپنے وطن عزیز اعظم گڈھ کو اپنی تمام آرزؤں کا محور بناتے ہیں، پہنچی وہیں کو خاک جہاں کا خمیر تھا، دنیا کے گوشے گوشے کی سیر، بڑی بڑی دانش گاہوں اور مراکز علم و تہذیب کی خاک اڑانے اور علی گڑھ سے حیدرآباد تک جہاں بھی علم و فضل کی خوشبو ملی رخت سفر باندھ چل

☆ٹانڈہ، ضلع امبیڈکر نگر۔

پڑنے والے اس مسافر خضر طریق کو بالآخر وطن کی خاک نے دل برداشتہ نہ کیا بلکہ نئے خوابوں اور ولولوں کے ساتھ واپس آنے پر مجبور کردیا اور ایسی قدردانی کا ثبوت دیا کہ آج تک اس کا آشیانہ فکر و تحقیق آباد اور اس کا خرمن علم و فضل سلامت ہے اور آج تک یکے بعد دیگرے بلند ہمت، درویش صفت، کام کی دھن میں مست و بے خود اصحاب علم و فضل کی ایک جماعت یہاں دھونی رمائے، وسائل سے بے پروا، سیاسی نوازشوں سے بے فکر اپنے کام میں سرتاپا غرق ہے۔

علامہ شبلی کی داستان اگرچہ یہیں سے شروع ہوتی ہے کہ اعظم گڈھ کے قصبہ چریا کوٹ میں قدیم انداز تعلیم و تربیت کے مراحل سے گزر کر اور مناظرانہ و کلامی ذوق و شاعرانہ افتاد طبع لے کر وہ ۱۸۸۲ء میں اپنے چھوٹے بھائی مہدی کی تعلیم کے دوران علی گڑھ وارد ہوئے اور اس کی دل کشی ان کے لیے زنجیر پا بن گئی، سرسید نے مدرسۃ العلوم میں انہیں رکھ لیا اور انہیں کی کوٹھی میں رہنے لگے، سرسید کی لائبریری نے ان کے شوق مطالعہ و جستجوئے علم کو مہمیز دی، روزانہ سرسید سے گھنٹوں صحبت رہتی اور گفت و شنید کا سلسلہ جاری رہتا، پروفیسر آرنلڈ سے دوستی ہوئی اور فرانسیسی زبان سیکھ لی، ۱۸۹۲ء میں آرنلڈ کے ساتھ قسطنطنیہ کا سفر کیا، سرسید کی وفات تک علی گڑھ سے یہ تعلق قایم رہا، اس ربط و ضبط اور قیام علی گڑھ نے علامہ شبلی کی شخصیت اور فکر و فن کی بالیدگی میں اہم کردار ادا کیا لیکن ان کا خمیر کسی اور مٹی سے اٹھا تھا، اسلامی غیرت و حمیت ان کی رگ رگ میں دوڑ رہی تھی، ان کے عہد میں مسلمانوں کی دولت و اقتدار تو باقی نہیں رہا تھا، صرف ایک تہذیبی سرمایہ تھا جسے وہ بڑی آرزوؤں اور امیدوں کے ساتھ سینے سے لگائے بیٹھے تھے اور وہ بھی معرض خطر میں تھا، مغربی تہذیب اپنی تمام تر دل کشی و رعنائی اور نت نئی ایجادات و انکشافات کے ساتھ جلوہ گر تھی اور مشرقی تہذیب کے لبادہ پر بے پناہ گرد و غبار اٹ چکا تھا، اکثر لوگوں کی زبان پر یہی نعرہ تھا، چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی، مغرب کے اثر سے دبستان سرسید کے اکثر اصحاب قلم مجرد عقلیت پر زور دے رہے تھے، اس ہجوم میں علامہ شبلی معتدل عقلیت کی راہ پر گامزن نظر آتے ہیں، وہ اپنے معاصرین میں سب سے ذہین اور کثرت مطالعہ، وسعت نگاہ اور بین العلومی دستگاہ کے اعتبار سے سب سے ممتاز تھے، مزاجاً خالص مشرقی ہونے کے باوجود وہ مغرب کے سرمایہ علم سے پوری طرح روشناس تھے، اگرچہ وہ انگریزی زبان میں ماہر نہ تھے مگر

یورپ کے فکری سرمایہ کو ان کے عہد میں عربی مصنفین نے خوب کھنگالا تھا، اس وسیلہ سے علامہ شبلی مستشرقین کی عیاریوں سے خوب واقف تھے جو نہایت سنجیدگی سے اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کی کوشش میں مصروف تھے، ان کے یہ الفاظ اس حقیقت کے غماز ہیں:

''یورپ کی غلط بیانیوں کا ایک دفتر ہے اور ایک ایک حرف کے لیے سیکڑوں اوراق الٹنے پڑتے ہیں، یہ کم بخت لکھتے تو جھوٹ ہیں لیکن بے پتہ نہیں لکھتے، ہمارے سیرت نگاروں نے خود بہت بے احتیاطیاں کی ہیں''۔

علامہ شبلی کی غیرت ایمان کا یہ حال تھا کہ اپنے ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مشاغل کے ساتھ یورپ کی اسلام کے خلاف ہرزہ سرائیوں اور بے بنیاد الزامات کی زندگی بھر تردید کرتے رہے اور اس کے لیے مسلسل جہد و کاوش کی، خامیاں کس انسان میں نہیں ہوتیں اور کچھ لوگ ایسے ہمیشہ رہے جنہیں مشاہیر کی زندگی میں کیڑے نکالنے کا حد درجہ شوق رہا ہے لیکن شیخ محمد اکرام کے الفاظ میں:

''آخر حالی، آزاد، محسن الملک اور وقار الملک کتنے آسمانوں کے تارے تھے، ان میں شبلی کی بوقلمونی کہاں سے آئے گی جو رندوں میں رند، زہاد میں زاہد، نثاروں میں نثار، شعرا میں شاعر، معلموں میں معلم، مورخوں میں مورخ، سیاست دانوں میں سیاست داں، اردو میں عشقیہ خطوط، تعلیم میں نئی روشنی کے آموزگاہ، علمی تصنیف و تالیف کے میدان میں ہمارے سب سے بانکے شہسوار، قلیل مدت حیات اور کمزور صحت کے باوجود شبلی نے جو کچھ کر دکھایا وہ ایک معجزہ سے کم نہیں ہے''۔

سرسید کی تحریک کے عناصر ترکیبی بہ قول ڈاکٹر سید عبداللہ مادیت، عقلیت، اجتماعیت اور حقائق نگاری تھے، ان رجحانات کے واضح اثرات اس عہد کے علم و ادب پر نظر آتے ہیں، وحید الدین سلیم، عبدالحلیم شرر، مولوی عبدالحق، صدر یار جنگ، طفیل احمد منگلوری، ظفر علی خاں، سجاد حیدر یلدرم، حسرت موہانی، رشید احمد صدیقی، عبدالماجد دریابادی، عابد حسین، ذاکر حسین، ہاشم فرید آبادی، حکیم احمد شجاع، الیاس سب بعد کی نسلوں میں ان سے اثر پذیر ہوئے لیکن سرسید کے خاص شارح و ترجمان نذیر احمد، حالی، محسن الملک بن کر سامنے آئے، علامہ شبلی کا معاملہ الگ ہے،

بہ قول سید عبد اللہ وہ سرسید سے متاثر تھے مگر ان کے تصورات کے سب سے بڑے باغی تھے اور ان کی حیثیت وہی ہے جو معتزلہ میں ابوالحسن اشعری کی ہے، انہوں نے عقل پسندی پر لگام لگائی اور عقل کا رشتہ وجدان سے جوڑ دیا، وہ مغرب کی متشککانہ تحریکوں پر سخت وار کرتے رہے اور اس معاملہ میں علامہ شبلی نے امام ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہ کا کردار ادا کیا، اگرچہ لوگوں کا خیال ہے کہ شبلی کو علامہ شبلی بنانے والے سرسید ہی تھے اور علوم جدیدہ سے وہ علی گڑھ ہی آکر روشناس ہوئے لیکن انہوں نے مغرب کے فلسفہ و علوم طبعی کی بنیادوں کو کھنگال کر استدلال کی گہرائی کے ساتھ ان کا رد کیا اور مشرقی قدروں کی مدافعت کی، علامہ شبلی ملت اور اسلامی فکر کے مزاج شناس تھے، انہوں نے دور جدید کے لیے نئے علم کلام کی ضرورت محسوس کی، سیاست و تعلیم کے میدان میں ان کے سرسید سے اختلافات آخری دور میں نمایاں ہو کر سامنے آگئے، علی گڑھ کے بجائے وہ ندوۃ العلما کی تحریک کے ترجمان بن گئے جو سرسید کی مجرد عقلیت کے خلاف بغاوت تھی۔

انیسویں صدی برصغیر میں اسلامی تہذیب کے لیے ہوش ربا چیلنج کے ساتھ آئی، یورپ کے صنعتی انقلاب نے سماج اور سیاست دونوں کو متاثر کیا، قدیم و جدید کی کشمکش بڑھنے لگی، پرانی چیزوں پر نفرت کی نگاہ ڈالنا اور نئی چیزوں کی طرف لپکنا لوگوں کے مزاج میں داخل ہو گیا، سائنس کے انکشافات و ترقیات نے لوگوں کا طرز فکر بدل ڈالنے کی کوشش کی خاص طور پر تہذیبی قدریں متاثر ہوئیں، زماں و مکاں کی وسعتیں سمٹنے لگیں تو لوگوں نے سمجھا کہ اب خیالات کا پرانا ڈھانچا بھی بدل ڈالنا ضروری ہے، جو پہلے خوب تھا اسے اب ناخوب ہونا چاہیے، مشرق کے پورے نظام فکر کے سامنے مغرب کی ایجادات اور قوائے فطرت کو قابو میں کرنے کے طریقوں نے یہ سوالیہ نشان کھڑا کر دیا کہ اب اس کی کیا ضرورت ہے، مغرب میں اگرچہ انقلاب فرانس نے قومیت آزادی اور جمہوریت کے ولولہ کا اظہار کیا تھا لیکن اس انقلاب کو مغرب نے اپنے استعماری اور سرمایہ دارانہ نظام کا ایک حصہ بڑی خوبصورتی سے بنا لیا تھا، وہ اپنے لیے تو جمہوریت و آزادی پسند کرتے تھے مگر ایشیا و افریقہ کے لوگوں کے پیروں میں غلامی کی بیڑیاں ڈالتے جارہے تھے، مغرب میں علم کا ماحصل یہ تھا کہ کسی ایک نقطے پر کبھی قدم نہ جمایا جائے اور ہر آن

بدلتے ہوئے خود ساختہ نظریات میں اس طرح بنی نوع انسان کو الجھا دیا جائے کہ وہ اپنے لیے کسی مرکز و محور کا تعین نہ کر سکیں جس طرح ایک بازی گر ایک کے بعد ایک ہوش ربا منظر ناظرین کے سامنے پیش کر کے ان کو دم بخود بنائے رکھنے کی کوشش کرتا ہے، سرسید احمد خاں اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ ابھی کتاب پریس میں ہوتی ہے کہ اس کے نظریات بدل جاتے ہیں، پروفیسر خلیق احمد نظامی انیسویں صدی میں عالم اسلام کی اس کیفیت کا جائزہ لیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''انیسویں صدی میں جب کہ دنیا اس تیزی سے بدل رہی تھی، مسلمان قدیم تہذیب کا خستہ لبادہ اوڑھے نہایت سکون سے بیٹھے تھے، کبھی افسانوی شتر مرغ کی طرح اپنی گردنوں کو عظمت گزشتہ کے ریگزار میں چھپا لیتے تھے، کبھی ان کی تھکی ہوئی قوتیں تصوف کے دامن میں پناہ لے لیتی تھیں، کبھی مہدی موعود کے انتظار میں زندگی کے حقائق سے فرار تلاش کر لیتے اور سمجھتے تھے کہ وقت کا جابر ہاتھ کبھی ان کے روز و شب پر اثر انداز نہ ہو سکے گا''۔ (ص ۲۲، علی گڑھ تحریک کا آغاز تا امروز، مرتبہ نسیم قریشی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۶۰ء)

اس عہد میں عالم اسلام میں پیام بیداری دینے والے متعدد روشن ضمیر افراد منظر عام پر آچکے تھے، ایران میں حجۃ الاسلام شیخ ہادی نجم آبادی، مصر میں مصطفی کامل، ترکی میں مدحت پاشا فواد پاشا، تیونس میں خیر الدین پاشا، الجیریا میں امیر عبدالقادر، نجد میں عبدالوہاب کے حلقہ فکر کے اکابر، طرابلس میں امام محمد سنوسی، افغانستان میں سید جمال الدین افغانی، روس میں مفتی عالم جان، ہندوستان میں سید احمد خاں اس صورت حال کا مقابلہ کر رہے تھے۔

ابوالکلام آزاد نے ''الہلال'' میں اس صورت حال پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، ان کے نزدیک یورپ کے تمدن کا ہوش ربا جلوہ اسلامی ممالک کے سامنے آیا تو ایک جماعت ارباب بینش و خبر کی اس سے اس طرح مرعوب و متاثر ہوئی کہ:

''مقابلہ و مقاومت کی جگہ تقلید و اطاعت کے جذبات اس کے اندر پیدا ہو گئے، ہندوستان میں سرسید احمد خاں اور ان کے متبعین و مقلدین، ترکی میں سلطان محمود خاں اور فواد پاشا، مصر میں محمد علی پاشا، تیونس میں خیر الدین اسی گروہ میں محسوب ہیں، انہوں نے اصلاح و تغیر کے

لیے صرف یورپ کی تقلید، علوم حدیث کی ترویج، عادات وخصائل فرنگ کے تخلق وتشبہ اوران کے ذہنی وعلمی تعبد واطاعت کو اساس کار واعتقاد اصلاح قرار دیا، دوسرا مذہب اصلاح سیاسی کا مذہب ہے، یہ وہ جماعت ہے جس کو اسلامی ممالک کے پولیٹیکل زوال اور سیاسی اختلال کا حد درجہ استغراق ہوا، اس لیے اس کی نظر اس طرف گئی کہ سب سے مقدم سیاسی اصلاح ہے، ممالک اسلامیہ میں اس کے سب سے بڑے داعی مرحوم سید جمال الدین افغانی اسد آبادی تھے، ترکی میں مدحت پاشا ابوالاحرار کی دعوت بھی اس مسلک میں محسوب ہے، تیسرا مذہب اصلاح دینی واسلامی کا ہے، مسلک اصلاح میں یہی گروہ اصحاب رشد وہدایت ہے''۔ (بحوالہ علی گڑھ تحریک، نسیم قریشی، ص ۲۳۲)

خلیق احمد نظامی کے الفاظ میں اس وقت تین مطالبات تھے: ۱- سیاسی اداروں میں مدافعت کی جان پیدا کی جائے، یہ اسی وقت ممکن ہے کہ مغرب کی اختراعات، ایجادات اور آلات حرب اور نئی فوجی تنظیم کو بلا کسی پس وپیش کے قبول کیا جائے، ۲- علم وہنر اور سماج وسیاست کے ان تمام قدیم ضروریات سے سبک دوشی حاصل کی جائے جو آزادی کی راہ میں سنگ گراں کی طرح حائل تھے، ساتھ ہی سائنس اور مذہب میں مطابقت پیدا کی جائے اور مذہب کی ان غلط تعبیروں سے نجات حاصل کی جائے جنہوں نے سائنس کو مذہب کا حریف بنا کر ذہنوں میں شکوک کی خلش پیدا کر دی تھی، ۳- ذاتی منفعت اور شخصی مفاد کی جگہ قومی وملکی خدمت کا جذبہ پیدا کیا جائے۔

اس عہد میں رفقائے سرسید میں کچھ لوگوں پر انگریزوں کا اس قدر خوف طاری تھا کہ وہ ڈپٹی نذیر احمد کے الفاظ میں اہل یورپ کے مقابلہ میں بہادری کے معنی خودکشی کے سمجھتے تھے۔ (لیکچر محمڈن ایجوکیشنل کانگریس منعقدہ لاہور، ۲۸؍دسمبر ۱۸۸۸ء)

سرسید نے جملہ مسائل کا حل تعلیم میں تلاش کر لیا تھا، وہ مسلمانوں کے سیاست سے الگ رکھنے کے قائل تھے۔

''جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پولیٹیکل امور پر بحث کرنے سے ہماری قومی ترقی ہوگی، میں اس سے اتفاق نہیں کرتا بلکہ میں تعلیم ہی کی ترقی بلکہ صرف تعلیم ہی کو ذریعہ قومی ترقی سمجھتا ہوں''۔

مصر کے علامہ رشید رضا نے بھی ندوۃ العلما لکھنؤ میں ایک جلسہ میں یہی خیال پیش کیا تھا:

''مقتضائے عقل ومصلحت یہ ہے کہ تمدنی وتعلیمی مصلحین سراً وعلانیۃً ہر طرح پالیٹکس سے بالکل الگ رہیں، جس کام میں پالیٹکس کی ذرا بھی آمیزش ہو جاتی ہے سارا کام غارت ہو جاتا ہے''۔ (لیکچروں کا مجموعہ، بحوالہ علی گڑھ تحریک، ص ۲۴۶)

حالانکہ یہی سرسید کبھی کبھی اپنے کو ریڈیکل یعنی انقلابی قرار دیتے ہیں:

''میری رگوں میں عرب کا خون گردش کرتا ہے اور مذہب اسلام جس پر مجھے پکا یقین ہے وہ بھی ریڈیکل اصولوں کو سکھاتا ہے''۔

لیکن انڈین نیشنل کانگریس کے قیام اور ملک میں اس کی رفتہ رفتہ مقبولیت کو سرسید نے نظر انداز کیا اور مسلمانوں کو اس سے بے تعلق رہنے کا مشورہ دیا، علامہ شبلی نے سرسید کے اس طرز عمل سے اختلاف کیا، سیاسی اعتبار سے وہ اپنے عہد میں سب سے زیادہ ترقی پسند اور باشعور انسان نظر آتے ہیں جو نوآبادیاتی نظام کی فتنہ سامانیوں اور مضرتوں کو سب سے زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں اور عالم اسلام کے سلسلہ میں مغرب کی ریشہ دوانیوں سے سب سے زیادہ بیدار وآگاہ نظر آتے ہیں، قوم، قوم پرستی اور وطنی قومیت کے الفاظ اس عہد کے اہل سیاست میں بے حد معروف ومقبول تھے، اگرچہ زیادہ لوگ ان اصطلاحات کے نقطۂ آغاز اور مغربی پس منظر سے ناواقف نظر آتے ہیں، ندوۃ العلما کے ۱۹۱۰ء کے اجلاس میں ''ندوۃ العلما کی ضرورت'' کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

''تمام قوموں کی قومیت ملک یا نسل یا خاندان کی بنا پر ہوتی ہے، مثلاً یہودی وہ قوم ہے جو بنی اسرائیل کے خاندان سے ہو، اگر کوئی شخص یہودیوں کے تمام معتقدات پر ایمان لائے تو وہ یہودی نہیں ہو سکتا اور اس کو یہودیوں کے ملکی ومذہبی حقوق حاصل نہیں ہو سکتے، یوروپین قوموں کی قومیت ملک کی بنا پر ہے، کسی اور ملک کا آدمی اگر عیسائی ہو جائے تو اس کو وہ ملکی حقوق نہیں حاصل ہو سکتے جو یورپ کو حاصل ہیں''، اس طرح علامہ شبلی کے نزدیک تمام ہندو ایک مذہب کے پیرو ہونے کے باوجود ایک قوم نہیں بلکہ وہ ذات پات کی بنیاد پر مختلف فرقوں میں منقسم ہیں، اس کے برخلاف مسلمانوں کی قومیت کی تشکیل میں ملک نسل اور خاندان جیسے عوامل کا کوئی رول نہیں بلکہ

اس کی بنیاد صرف مذہب اسلام ہے، لہٰذا دنیا کے کسی ملک یا خطہ کا کوئی شخص جب کلمۂ طیبہ پڑھ لیتا ہے تو وہ مسلم قوم میں شامل ہوجاتا ہے اور اس کے حقوق دیگر مسلمانوں کے مساوی ہوجاتے ہیں، چنانچہ ان کے نزدیک اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس کے مطابق کلمۂ طیبہ پڑھنے والا کوئی بھی شخص ذات پات، رنگ، نسل، زبان، ملک وغیرہ پر مبنی تمام امتیازات سے بالاتر ہوکر ایک قوم میں تبدیل ہوکر دوسرے شخص کا بھائی ہوجاتا ہے، علامہ شبلی ہی کے الفاظ میں ''جب ہماری قومیت، ہمارا وجود، ہماری نیشن کل کی کل مذہب ہے تو ہمارا محور، ہمارا مرکز گردش فقط مذہب ہے، فقط دین ہے اور کوئی چیز نہیں''۔ (''مضمون تحفظ مذہب'' از خطبات شبلی، ص ۱۲۸، بحوالہ اردو دانش وروں کے سیاسی میلانات ''مظہر مہدی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی)

علامہ شبلی کے نزدیک جس طرح نظام شمسی میں آفتاب کے گرد تمام سیارے حرکت کرتے ہیں، اسی طرح مسلمانوں کی آرزوؤں اور تمناؤں کا محور اسلام ہے، وہ اپنے اندر اگر قوت عمل کو بیدار کرسکتے ہیں تو صرف اپنے عقیدہ و یقین کے ذریعہ، وہ اپنے خطبہ ''ندوۃ العلما کی ضرورت'' میں صاف طور پر لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کی قومی ترقی اور قومی ضرورت کا مسئلہ دراصل مذہبی ترقی اور مذہبی ضرورت کا مسئلہ ہے، قوم کا لفظ جو نہایت بلند آہنگی سے ہزاروں دفعہ دہرایا گیا اور اس نے کوئی زندگی نہیں پیدا کی، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ خود غلط تھا، اس لفظ کو بدل کر اسلام کا لفظ اختیار کرنا چاہیے، ہماری قومیت، ہمارا مذہب ہے اور ہم میں یہی لفظ اور صرف یہی زندگی پیدا کرسکتا ہے''، بہ قول مظہر مہدی وہ اسلام کو عیسائیت اور ہندومت سے بہتر ثابت کرنا چاہتے ہیں، اس لیے کہ اس مذہب کے پیروؤں میں کسی قسم کا امتیاز نہیں برتا جاتا اور رنگ و نسل، ملک و زبان اور ذات پات کی بنا پر امتیازات روا نہیں رکھے جاتے، یہی آواز بیسویں صدی کے نصف اول پر مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی بلند کی، اس عہد میں بدقسمتی سے برصغیر میں قوم پرستی اور قوم کی بحث مسلمانوں کی مذہبی شخصیتوں میں وجہ نزاع بن گئی، مولانا حسین احمد مدنی زور و شور سے یہ دعوا کررہے تھے کہ وطنی قوم پرستی اسلام کے مزاج سے ہم آہنگ ہے اور لفظ قوم کی وہ اپنے مخصوص انداز سے تشریح و تعبیر کرتے ہوئے اعلان کرتے تھے کہ قومیں اوطان سے بنتی

ہیں اور محض ملی اتحاد یا پان اسلام ازم کے ذریعہ مسلمانوں کے احوال میں کوئی انقلاب نہیں پیدا ہوسکتا، انہوں نے یہ دعوا کیا کہ:

''افسوس مسلمانوں میں اس وقت کوئی شخص مسلمانوں کو متحدہ قومیت اور ایفائے وطنیت، نسل و لسان وغیرہ کا واعظ کھڑا نہ ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پان اسلام ازم ایک قصہ پارینہ ہوکر فنا کے گھاٹ اتر گیا اور ممالک اسلامیہ یورپین اقوام کے لیے لقمہ تر بن گئے''۔

مولانا مودودی نے اس رسالہ کے جواب میں اپنا بسیط مقالہ بہ عنوان مسئلۂ قومیت لکھا، انہوں نے مولانا کو آگاہ کیا کہ مسلمانوں کی وحدت ملی کی حمایت میں ٹیپو سلطان، جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، مصطفی کامل مصری، امیر شکیب ارسلان، انور پاشا، شبلی نعمانی، سلیمان ندوی، محمود الحسن، محمد علی، اقبال و ابوالکلام نے نسلی، وطنی اور لسانی بتوں کی پرستش سے دور رہنے کا مطالبہ کیا، علامہ اقبال کا یہ شعر اس وقت بچے بچے کی زبان پر تھا ؎

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہوجا — نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

علامہ شبلی اس معاملہ میں اقبال و مودودی کے پیش رو تھے کہ انہوں نے صاف صاف اعلان کیا:

''مسلمانوں کو قوم کے نام سے اٹھانے کی کوشش تیس برس سے جاری ہے مگر اس کی ناکامی ظاہر ہے کیوں کہ محمد ﷺ کی امت اسلام کے نام سے جاگتی ہے، اس نام سے اس کو پکارو، پھر دیکھو بیداری کا کیا عالم ہوتا ہے''۔

اس وقت جب کہ مغربی تہذیب از سر نو مشرقی ثقافت کو پابہ جولان بنانے کی سرتوڑ کوشش کررہی ہے اور زندگی کا ماحصل انسان کی مادی چمک دمک، عیش و آسایش، تزک و احتشام تک محدود ہوگیا ہے اور زندگی کے روحانی و اخلاقی پہلو کو فضول و غیر ضروری قرار دیا جارہا ہے، ہمارے کانوں میں شبلی کے یہ تاریخی جملے گونج رہے ہیں:

''مسلمان اگر مذہبی اثر سے آزاد ہوکر ترقی کریں تو ایسی ترقی سے تنزلی ہزار درجہ بہتر ہے، دوسری قوموں کی یہ ترقی ہے کہ آگے بڑھتے جائیں لیکن مسلمانوں کی یہ ترقی ہے کہ وہ پیچھے

بنتے جائیں، یہاں تک کہ صحابہؓ کی صف میں جا کر مل جائیں''۔

بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں علامہ شبلی کے اندر جذباتیت کے باوجود غیر معمولی علمی توازن اور مفکرانہ بلندی ملتی ہے، علم وفضل کی خوشبو ان کی ہر سطر سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، ان کی بعض تحریروں کو ممتاز ناقدین نے فلسفیانہ نثر کا بہترین نمونہ قرار دیا ہے، ایسی تحریروں میں انہوں نے اپنے شاعرانہ ذوق کو غالب ہونے کا موقع نہیں دیا ہے، گرچہ کچھ لوگوں کو علامہ شبلی سے شکایت بھی ہے کہ ان کے یہاں شخصی عنصر ان کے علمی و تاریخی مباحث پر ضرورت سے زیادہ حاوی ہوجاتا ہے یعنی وہ معروضی انداز (Objective way) سے زیادہ دیر تک سلسلہ کلام نہیں جاری رکھ پاتے لیکن ڈاکٹر عبداللہ اور دیگر ناقدین اس کے معترف ہیں کہ علامہ شبلی کے اندر جو احساس کمال اور احساس عظمت ہے وہ ان کی نثر کو بلند آہنگی اور قوت و جوش کی رفعت عطا کرتا ہے، بہ قول ڈاکٹر عبداللہ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۳۵ء تک اردو کے دبستانی ادب پر ان کی معتدل عقلیت کا دور دورہ رہا، اس میں شک نہیں کہ جب ہم دارالمصنفین کی تقریباً نوے سالہ خدمات کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس ادارہ نے ہمارے علمی ورثہ، ہماری تہذیب، ہماری تاریخ، یادگار شخصیتوں اور ہماری اقدار و روایات کے نقوش کو تابناک بنانے اور ان سے متعلق علمی سرمایہ کو محفوظ رکھنے اور انہیں عصری پس منظر میں پیش کرنے کا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے اور اس کے بانی علامہ شبلی نعمانی کے لیے شکر و سپاس کے جذبات سے ہمارا سینہ لبریز ہوجاتا ہے۔

علامہ شبلی کی بعض تحریروں کے بارے میں کچھ لوگ یہ محسوس کرتے رہے ہیں کہ انہوں نے مدافعتی جنگ کا انداز اختیار کیا ہے، ''جزیہ'' اور ''اسکندریہ کے کتب خانہ کی آتش زنی'' میں انہوں نے بجا طور پر داد تحقیق دی ہے مگر کاش اپنی گوناگوں مصروفیات کے دوران انہیں یورپ کے اخلاقی زوال کی عبرت ناک داستان پڑھنے اور ان بنیادی اسباب پر غور کرنے کا موقع ملتا جنہوں نے مغرب کو اسلام سے بیزار و برگشتہ کر رکھا ہے، اس سلسلہ میں بنیادی اور راست حوالوں سے وہ محروم رہے اور ان کا انحصار مستشرقین کی عربی و فارسی میں لکھی ہوئی تصانیف پر رہا، ان کو اگر مزید فرصت حیات ملتی اور وہ یورپ کے فکری تضادات کی مزید گہرائیوں میں اترتے اور فرانسیسی انقلاب کے بعد مختلف مادہ پرستانہ نظریات کے فروغ کی وجہ سے جو تبدیلیاں آگئیں اور

اس نے مشرق اور خاص طور پر اسلام کو جن اسباب سے اپنا خطرناک حریف تصور کرنا شروع کردیا، اس کا وہ پورا جائزہ لیتے اور شاید بیسویں صدی کے اہل قلم کی جنہوں نے ان کی راہ پر گامزن ہوکر ان موضوعات پر بعد میں خوب لکھا لکھایا مکمل راہ نمائی کرسکتے۔

انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں فلسفہ تاریخ نے دنیا کی مختلف زبانوں بالخصوص انگریزی زبان میں دیگر علوم وفنون کے درمیان سب سے بلند مقام حاصل کرلیا اور اسے اس قدر اہمیت حاصل ہوگئی جیسی کہ ماضی میں دنیا کی مختلف زبانوں میں رزمیہ (epic) شاعری کو حاصل تھی، دنیا کے بڑے بڑے اہل قلم کی یہ جولان گاہ بنی ہوئی تھی، پھر ہمارا یہ عبقری مصنف و انشاپرداز بھلا اس صنف سے کیوں کر غافل رہتا، اس نے تاریخ اور سوانح نگاری کی بزم گاہ اس لیے بھی اپنی تگ و تاز کے لیے منتخب کی کہ وہ انگریزی زبان و تہذیب سے مرعوبیت کو ختم کرنا چاہتے تھے، اس وقت جو غیر معمولی ثقافتی شکست و ریخت جاری تھی اور مغرب سے مرعوبیت لوگوں پر مستولی ہوتی جارہی تھی، اس کا تقاضا بھی تھا کہ مغرب کے مکروہ پہلوؤں کے بالمقابل اپنی تاریخ کے درخشاں پہلوؤں کو نمایاں کیا جائے، علامہ شبلی اپنے ایک خط میں مغرب کے نقالوں کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''انگریزی خواں طبقہ نہایت مہمل ہے، مذہب کو جانے دو، یہ خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں، یہاں ان چیزوں کا ذکر نہیں آتا، بس کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہے''، مہدی افادی کے الفاظ میں جو علامہ شبلی کے ہم عصر اور قدرداں تھے، فلسفہ تاریخ جو آج مکمل تمام علوم میں سرفہرست ایک مستقل فن بن گیا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے فاضل مورخانہ موشگافیوں کو بہترین مشغلہ سمجھتے ہیں، علامہ شبلی اس فن میں ہندوستان نہیں تمام اسلامی دنیا میں کسی سے دوسرے درجہ پر نہیں، اس میں شک نہیں کہ وہ بہترین مغربی مورخین کے پہلو بہ پہلو ہوسکتا ہے''۔

مغرب میں اس عہد میں بہ کثرت مغربی و عیسائی مشاہیر پر کتابیں آرہی تھیں، کارلائل ان میں پیش پیش تھا، اس طرح اپنے رجال و اکابر کے ذریعہ بھی مغرب اپنی تہذیبی برتری کا رعب بٹھانا چاہتا تھا، دنیا کی تمام غالب قوموں کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ اپنی تاریخ کو جھاڑ پونچھ کر

اس طرح پیش کرتی ہیں کہ لوگ ان سے مرعوب ہوں، شبلی اگرچہ ایک شکست خوردہ مشرق کے چشم و چراغ تھے مگر مغرب کے سامنے اس معاملہ میں جھکنے کو تیار نہ تھے، انہوں نے تاریخ کو اپنے عہد کے سائنٹفک تقاضوں سے ہم آہنگ کیا اور ہیرو ورشپ کا انداز اختیار نہ کیا جس میں ممدوح کو مابعد الطبیع بنا کر پیش کرنے اور تاریخ کو دیومالا اور افسانے کا رنگ دینے کی کوشش کی جاتی تھی، علامہ شبلی کی مشہور کتاب ''المامون'' کا ۱۸۸۹ء میں مقدمہ لکھتے ہوئے سرسید نے بجا طور پر اعتراف کیا ہے کہ فاضل مصنف نے تاریخی اصلیت و واقعیت کا دامن تھامے رکھا ہے، ''سیرت النعمان'' میں بھی انہوں نے عقیدت و تعظیم کو حقیقت نگاری پر غالب آنے نہیں دیا ہے اور تاریخی حقائق کی جانچ پڑتال کا شوق انہیں روم و شام لے گیا اور وہاں کی لائبریریوں سے استفادہ کی مشقتیں برداشت کیں، ان کا سب سے بڑا تاریخی کارنامہ ''الفاروق'' ہے جو اسلامی تاریخ کی سب سے عظیم المرتبت شخصیت حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے حالات زندگی، ان کے کارناموں اور اس عہد کی تاریخ پر مشتمل ہے، ناقدین کی رائے ہے کہ علامہ شبلی نے ایک مورخ و محقق کی حیثیت سے اپنے ذہن و دماغ کی اعلا صلاحیتوں کا اس کتاب کی تصنیف میں مظاہرہ کیا ہے، اس کے لیے انہوں نے بے شمار قدیم و نایاب کتب کا عرق ریزی کے ساتھ مطالعہ کیا اور تمام واقعات کی پوری چھان بین کے بعد قلم اٹھایا ہے، حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے کارناموں سے ہمیشہ مغرب اور دشمنان اسلام کو بیر رہا ہے، مستشرقین نے طرح طرح کی غلط بیانیاں اس عظیم المرتبت انسان کے سلسلہ میں کی ہیں، شبلی نے سارے گرد و غبار کو صاف کیا ہے اور الزام تراشیوں کو دلائل و قطعی ثبوتوں کی روشنی میں رد کیا ہے اور اصل سچائیوں سے پردہ ہٹایا ہے، ان کو خود اپنی اس تصنیف پر ناز تھا جس کا اظہار مدیر ''زمانہ'' کان پور کے نام اپنے ایک خط میں انہوں نے کیا ہے۔

علامہ شبلی صرف مورخ ہی نہیں ایک ثقافتی مرقع نگار اور معاشرتی نقاد بھی ہیں، تاریخ اسلام میں خلیفہ ہارون رشید و مامون رشید کا عہد بڑی دل کشی کا سامان رکھتا ہے، اس عہد میں ثقافتی مشاغل اپنے نقطۂ عروج پر تھے، شبلی کے مرقع نگار قلم نے اس موضوع پر کیسے کیسے نقش و نگار بنائے ہیں، انہیں دیکھ کر ہم محو حیرت ہو جاتے ہیں، ڈاکٹر عبداللہ کے الفاظ میں مامون کی شخصی تصویر کے مقابلہ میں اس کے ماحول کا مرقع زیادہ خوش نما نظر آتا ہے، ساتھ ہی ان کی سوانحی

کاری گری اور کمال ہنر کا اس سے پتہ چلتا ہے اگرچہ ان کے یہاں اپنے ہیروؤں کے معایب کا ذکر بہت کم ہے، شاید یہ ان کا غیر معمولی ملی جذبہ ہے جو مغرب کے مقابلہ میں خود اپنی تاریخ کے کسی تاریک گوشے کو نمایاں کرنے میں سد راہ ہے، چنانچہ بہ قول ڈاکٹر عبداللہ وہ اپنے ہیروؤں کے غیر منصفانہ اعمال کی کبھی کبھی تاویل کرتے نظر آتے ہیں کہ اس وقت ساری کی ساری اسلامی سوسائٹیاں اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں، حالانکہ یہ عیوب صرف امرا و سلاطین میں تھے، عام مسلم سوسائٹی ان سے مبرا تھی، شاید کارلائل کی ہیرو ورشپ کا وہ جواب دینا چاہتے تھے اسی لیے ان کی کمزوریوں سے صرف نظر کرنا پڑا، علامہ شبلی اردو کے پہلے مورخ ہیں جس نے قدیم تاریخ کو نئے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا اور دبستان سرسید کے عام مزاج کے مطابق تاریخ میں اصول عقلی کے استعمال کو ضروری قرار دیا، انہوں نے تاریخ کو تہذیب انسانی کا ترجمان قرار دیا اور مسلمانوں کی فتوحات کے اسباب کی گہرائیوں میں اتر کر یہ واضح کیا کہ اس کا اصل سبب اسلامی تعلیمات تھیں جس نے ان کے اندر حسن اخلاق اور بلندی کردار پیدا کر دی تھی۔ وہ فاروقی فتوحات کا موازنہ سکندر و چنگیز سے کرتے ہیں اور اسلامی نظام کا رومن امپائر کے نظام سے موازنہ کرتے ہیں، کبھی کبھی ان کا انداز مدافعانہ ضرور محسوس ہوتا ہے گویا وہ مستشرقین کی غلط بیانیوں کا جواب دے رہے ہیں، اس وقت عام طور پر ہمارے اہل قلم کا انداز بیان مدافعانہ ہوا کرتا تھا، ایسے ماحول میں علامہ شبلی کا یہ کارنامہ قرار دیا جائے کہ انہوں نے تاریخ کو اعلا مقاصد کی حرارت عطا کی، ڈاکٹر عبداللہ کے الفاظ میں ان کے نظریہ تاریخ کا سنگ بنیاد یہ ہے کہ ایک صالح معاشرہ کے لیے چند قدرتی قوانین ہیں، انسان جس زمانہ اور جس دور میں ان پر عمل کریں گے اس میں ان کی تہذیب صالح ہوگی، اس کی صالحیت حال و مستقبل کی طرح ماضی میں بھی ممکن ہے، ان کے نزدیک ترقی و صالحیت جذبات صالحہ پر منحصر ہے، وہ تاریخ کا یہ مقصد قرار دیتے ہیں کہ ان واقعات و حالات کا پتہ چلایا جائے جن سے یہ دریافت ہو کہ موجودہ زمانہ گزشتہ زمانہ سے کیوں کر بہ طور نتیجہ پیدا ہوا، المامون میں لکھتے ہیں کہ تاریخ ہی قومی جوش کو زندہ رکھ سکتی ہے، اگر یہ نہیں تو قوم قوم نہیں، اس طرح انہوں نے اہل مشرق کو اپنے تاریخ کے خزانہ سے فیض یاب ہونے کی سہولت مہیا کر دی تاکہ وہ مغربی سپہ سالاروں، جنگجوؤں اور

رہنماؤں کی ذہنی مرعوبیت سے نکل سکیں، انہوں نے تاریخ کو اپنی قوم کی ذہنی بیداری کا پورا وسیلہ بنادیا۔

جمال الدین افغانی کے بارے میں بلنٹ نے لکھا ہے کہ "وہ اپنے خیالات میں پکے اور پوری طرح ایشیائی تھے، آسانی سے یورپین رسوم و عادات سے مانوس ہوتے تھے"، بالکل یہی حال علامہ شبلی کا بھی تھا کہ وہ اپنے آخری لمحات تک اپنی وضع قطع، آداب واطوار اور فکر و خیال پر اعتبار سے خالص مشرقی برقرار رہے اور دبستان سرسید کے بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح اپنا طرز حیات تبدیل نہ کیا۔

علامہ شبلی اردو زبان کے ایک بلند پایہ نقاد ہیں، اگرچہ ان کے تنقیدی تصورات عربی فارسی اور اردو کے قدیم تصور شعر و ادب سے ہم آہنگ ہیں اور وہ عہد سرسید کے انقلاب آفریں تصورات سے خود بہت زیادہ ہم آہنگ نہیں گرتے، ان کے نزدیک الفاظ کی اہمیت خیال سے زیادہ ہے لیکن لفظ و مضمون میں وہ ابن رشیق کے اس خیال کی تائید بھی کرتے ہیں کہ لفظ جسم اور مضمون روح ہے اور ان دونوں کا ارتباط باہم روح و جسم کا ہے لیکن وہ آخر میں الفاظ کو مضمون پر فوقیت دیتے ہیں، البتہ علامہ شبلی شاعری اور سوسائٹی کی تبدیلی کو لازم ملزوم سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک شاعری میں اگرچہ وہ ذوقی و وجدانی ہے، قومی و ملکی خصوصیات کا جھلکنا ضروری ہے، چنانچہ خود علامہ شبلی کی شاعری صرف الفاظ کا کھیل نہیں بلکہ حالی کی طرح قومی و عصری احوال کا مرقع ہے، وہ سرسید کے دبستان فکر و نظر اور انداز اسلوب و اظہار سے وابستہ نظر آتے ہیں جب وہ شعر العجم میں متاخرین شعرا پر تنقید کرتے ہیں اور خیال بندی، مضمون آفرینی، رنگین بیانی پر ناپسندیدگی ظاہر کرتے ہیں اور سادگی کے بجائے پیچ دے کر بات کو کہنے کی عادت کو بے لطفی کا سبب قرار دیتے ہیں، علامہ شبلی لکھتے ہیں "شعر کی اس سے زیادہ کوئی بدقسمتی نہیں کہ تخیل کا بے جا استعمال کیا جائے، وہ تخیل بیکار و بے اثر ہوتا ہے جس میں تمام عمارت کی بنیاد صرف لفظی تناسب اور ایہام پر ہوتی ہے، جب تخیل کو بے اعتدالی کا موقع ملتا ہے تو وہ دور از کار و فرضی استعارات و تشبیہیں پیدا کرتی ہے"، علامہ شبلی پیچیدگی، دقت پسندی اور مضمون آفرینی کے مصنوعی انداز کی مذمت کرتے ہیں، وہ اگرچہ اپنی فارسی غزلوں میں رندی و شوخی کی طرف مائل نظر آتے ہیں لیکن

مثنوی "صبح امید" سے ان کی شاعری کا ایک ولولہ انگیز رخ سامنے آتا ہے، یہ مثنوی ۱۸۸۵ء میں لکھی گئی اور قوم و ملت کی آرزوؤں کی ترجمان بن گئی، اس میں رجائیت، زور و تڑپ، ربط و تسلسل اور لفظی و معنوی سطح پر مکمل ہم آہنگی ہے، وہ ایک قادر الکلام صاحب فن سے ہمیں متعارف کراتی ہے ؎

وہ قوم کہ جان تھی جہان کی — جو تاج تھی فرق آسمان کی
تھے جس پہ نثار فتح و اقبال — کسریٰ کو جو کرچکی تھی پامال
گل کردیے تھے چراغ جس نے — قیصر کو دیے تھے داغ جس نے
وہ نیزۂ خوں فشاں کہ چل کر — ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
روما کے دھوئیں اڑا دیے تھے — اٹلی کو کنوئیں جھکا دیے تھے

علامہ شبلی کی طنزیہ شاعری بھی اکبر کی طرح بلند مقاصد اور اعلا نصب العین کی تابع ہے، بہ قول وزیر آغا "ان کی طنزیہ نظموں کے پس پشت خلوص کا ایک ایسا بحر بیکراں موج زن ہے کہ وقت گزر جانے کے باوجود اس کا تاثر زندہ و تازہ ہے"۔

علامہ شبلی صرف انشاپرداز، نقاد، محقق، شاعر، سوانح نگار اور مورخ ہی نہیں، ایک اعلا پایہ کے معلم بھی ہیں، انہیں یہ شدت سے احساس تھا کہ دنیائے اسلام میں مسلمانوں کا نظام تعلیم جمود و فرسودگی کا شکار ہو چکا ہے اور زمانے کے ارتقا کا ساتھ دینے کی اہلیت کھو چکا ہے، اس کی وجہ سے جدت ایجاد کا مادہ قوم سے سلب ہوتا جارہا ہے، انہیں یہ شدید احساس تھا کہ مسلمان علم و تحقیق اور ایجاد و اختراع میں یورپ سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور اپنے اسلاف کی متاع گم گشتہ کو حاصل کرنے کا جذبہ بھی نہیں رکھتے، علامہ شبلی اپنی گوناگوں علمی و تحقیقی و تصنیفی مصروفیات کے باوجود زندگی کے ہر دور میں کسی نہ کسی نہج سے درس و تدریس سے وابستہ رہے، وہ افسوس کرتے ہیں کہ اس دور کے محققین و مصنفین میں یہ بات موجود نہیں، اس لیے وہ نئی نسلوں کو اپنے خوابوں میں رنگ بھرنے کے لائق نہیں بنا پائے اور اپنے پیچھے تربیت یافتہ افراد کی ٹیم نہیں چھوڑ جاتے جب کہ ان کے اسلاف کا یہ طرز عمل تھا کہ وہ ہمیشہ کتابوں کے ساتھ انسانی دنیا سے گہرا ربط رکھتے تھے اور نئی نسل کی تراش خراش اور تعلیم و تربیت سے کبھی غافل نہیں رہتے تھے، خوش قسمتی سے ان کو

اسی فکرمندی کی یہ دولت اور تدریسی مشغلہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے نادر اور نرالے افراد اور باصلاحیت افراد کی ایک ایسی جماعت ملی جس نے ان کے ادھورے کام کو پورا کیا، اس جماعت نے اسلاف کے جواہر پاروں کو ضایع نہ ہونے دیا اور علم وفکر کے چراغوں کی لویں کم نہ ہونے دیں، علامہ شبلی کی معلمانہ زندگی کا آغاز سرسید کے مدرسۃ العلوم سے ہوا، پھر یہ شوق ندوہ تک جاری رہا، جب انہوں نے اعظم گڈھ میں دارالمصنفین کی بنیاد رکھی تو اس ذوق نے وطن کی سرزمین پر گل بوٹے کھلائے، انہیں کے تربیت یافتہ مولانا حمید الدین فراہیؒ نے سرائے میر اعظم گڈھ میں مدرسۃ الاصلاح کو پروان چڑھایا اور یہ اسلامی علوم وتحقیق کا ایک بڑا مرکز بن گیا جس سے بے شمار اہل علم منظر عام پر آئے، علامہ شبلی نئی اور پرانی تعلیم کی آویزش کو پسند نہ کرتے تھے اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی قدیم سرمایہ علم وفن سے بے تعلقی پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"یہ مسئلہ آج کل ہندوستان میں بھی چھڑا ہوا ہے اور قدیم تعلیم کی ابتری پر عموماً رنج وافسوس کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن میرا افسوس دوسرے قسم کا افسوس ہے، ہمارے ملک کے نئے تعلیم یافتہ پرانی تعلیم پر جو رنج وافسوس ظاہر کرتے ہیں وہ درحقیقت رنج نہیں بلکہ استہزا وشماتت ہے، میں اگرچہ نئی تعلیم پسند کرتا ہوں اور دل سے پسند کرتا ہوں تاہم پرانی تعلیم کا سخت حامی ہوں اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی قومیت کو قایم رکھنے کے لیے پرانی تعلیم ضروری اور سخت ضروری ہے"۔

غرض علامہ شبلی نعمانی نے مغربی سامراج کے عین عہد شباب میں علم وفکر، ادب وانشا کے مختلف شعبوں میں مشرق کی عزت ووقار کا پرچم بلند کیا اور ذہنی مرعوبیت کے دلدل سے نکال کر ہمارے اہل قلم کی ایک بڑی نسل کو اپنی تہذیب وروایات کے مثبت پہلوؤں کی طرف متوجہ کردیا، بیسویں صدی میں برصغیر میں مختلف علوم وفنون میں مسلم مفکرین، دانش وروں اور اصحاب علم وقلم کی ایک بڑی جماعت منظر عام پر آئی اور یہ سب کے سب علامہ شبلی کے سرچشمۂ فکر وتحقیق سے سیراب ہوتے نظر آتے ہیں۔

❊❊❊❊❊

دارالمصنفین سے بیاضِ مظہر جان جاناں "خریطۂ جواہر" کا شائع شدہ ایڈیشن

از:- نواب رحمت اللہ خاں شروانی☆

و

ڈاکٹر عابد رضا بیدار☆☆

سید سلیمان ندویؒ، شاہ معین الدین ندویؒ، صباح الدین عبدالرحمانؒ اور اب ضیاء الدین صاحب جیسے علم دوست، ادب اور علم کا سنگم اور اعلا ادبی ذوق والوں پر مبنی دارالمصنفین (اعظم گڈھ) بہت اچھے کام کرتا رہا ہے مگر فارسی ادبیات پر جو کتابیں شائع ہوئیں ان کی صحت طباعت کی طرف ضروری توجہ نہ ہو پائی، غلط کتابت، غلط طباعت کا یہ سلسلہ شعر العجم سے چلا جو شبلی کے بعد کئی بار بلکہ بارہا چھپی، شعر العجم نے مولانا آزاد سے اب تک ہزاروں پڑھنے والوں ادبی ذوق کی تربیت کی ہوگی، شبلی کی روح کو کتنی تکلیف ہوتی ہوگی جب وہ اپنا ادبی شاہکار ایسا غلط چھپا ہوا دیکھتے ہوں گے، اس کے اغلاط کے بارے میں تفصیل پھر کبھی، فی الحال مظہر جان جاناں (= جانِ جاں) کی خریطۂ جواہر کے دارالمصنفین ایڈیشن میں کتابت، طباعت کے جو اغلاط پائے گئے، ان کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے اور وہ بھی صرف اس لیے کہ فارسی کتابیں بھی صحیح چھپا کریں تو دارالمصنفین نے جو اعلا معیار غیر فارسی مطبوعات میں قائم رکھا ہے وہ یہاں بھی در آئے۔

اس سے یہ مقصد بھی ہے کہ طلبۂ فارسی کا ذوق صحیح طور سے تربیت پاسکے، خاص کر اس لیے

☆ مزمل منزل، علی گڑھ۔ ☆☆ کٹرہ، رام پور۔

بھی کہ چند ماہ قبل دارالمصنفین کی طرف سے ایک اعلان دیکھا تھا کہ دارالمصنفین اپنی فارسی کتب کی اشاعتِ نو کا پروگرام بنا رہا ہے، اگر ایسا ہے تو بہتر ہوگا کہ پروف ریڈنگ کسی فارسی داں کے سپرد کردی جائے، دارالمصنفین ہم سب کی مشترک تاریخی میراث ہے، اس کا قابل قدر معیار کسی بھی جگہ کم ہوا اس سے ہم سب کو تکلیف پہنچے گی۔

مدت ہوئی، بیس تیس سال سمجھ لیں، جب یہ بحث چھڑی تھی مگر چھڑ کے رہ گئی اور وہ نتیجہ برآمد نہ ہوا جو اس بحث کا منشا تھا! بحث یہ تھی کہ طبع ناموزوں رکھنے والے صاحبوں کو کلام موزوں (یعنی شاعری) کی تدوین، ترتیب، ترجمہ، تنقید یا تشریح وتعبیر سے باز رہنا، آجانا چاہیے، ع لاکھ کوئی انکار کرے، پردل سے سب ہی مان گئے، یہ مان گئے کہ تھیس تو صحیح ہے، مگر نتیجہ وہ برآمد نہ ہوا جس کی توقع تھی، طبع ناموزوں ہو تو ہوا کرے، ع مگر دل کے ہاتھوں ہے مجبور بندہ، طبع ناموزوں کلامِ موزوں پر طبع آزمائی کے لیے دل کے ہاتھوں مجبور ہو تو صبر کے سوا چارہ بھی کیا ہے، بس اتنا ہے کہ صبر تو کیا جائے مگر پڑھنے والوں کو گمراہی سے بچانے کے لیے کبھی توجہ بھی دلادی جائے، موجودہ تحریر کی بس اتنی ہی اور بس یہی حقیقت ہے، اس سے آگے یا اس سے زیادہ، غرض اس سے کسی کے علم وفضل پر حرف گیری مقصود ہرگز نہیں کہ یہ سارا معاملہ علم وفضل کا ہے ہی نہیں بلکہ صرف طبعِ موزوں کا ہے، شاید ذوق شعری کا بھی!!

سید سلیمان ندویؒ کے جانشین شاہ معین الدین ندویؒ ۱۳ر دسمبر ۱۹۷۴ء کو اللہ کی رحمت میں جا ملے، مورخہ ۱۰ر جون ۱۹۷۵ء کے دیباچہ نگار کے مطابق "خریطۂ جواہر" سلسلۂ دارالمصنفین کی ۱۲۵ویں کتاب ہے جس میں "مرزا مظہر جان جاناں کی مشہور بیاض خریطۂ جواہر پر مختصر تبصرہ کے ساتھ، منتخب فارسی کلام کا دلآویز اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے"، دیباچہ نگار صباح الدین عبدالرحمانؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کتاب مصنف کی آخر زندگی کی تحریر ہے جو معارف میں مضامین کے ایک سلسلہ کے طور سے "شروع" ہوئی اور شاہ صاحب کی وفات کے بعد "ارباب علم کے اصرار" پر اس "سلسلہ کو کتاب کی صورت میں شائع" کرنے کا فیصلہ ہوا۔

کاتب اس کتاب کے "اقبال احمد" ہیں۔

۱۲۴ صفحوں کی اس کتاب میں ۱۲۴ سے کہیں زیادہ اغلاط ہیں، ان میں کچھ اغلاط کتابت

ہیں، کہیں مرتب سے کچھ سہو ہوگیا ہے، تو یہ تصحیح نامہ ملاحظہ ہو:

۱- بجائے سنگ طفلاں پار ہائے شیشہ باید زد + چو مظہر مرزا دیوانہ نازک طبیعت را (ص ۴)، مرزا کو میرزا پڑھے بغیر مصرعہ موزوں نہ ہوگا (مطبوعہ دیوان میں بھی میرزا ہے)۔

۲- زصد جا چاک سازد جامہ را اندامش از شوخی + چوں آں صہبائے پُر زورے کہ رمینا نمی گنجد (ص ۴)، چوں کو چو پڑھا جائے۔

۳- برنگ غنچہ گراندک نسیمے باز میگردد + اگر حرفے پر سد باز دل دفتر بروں آید (ص ۵)، آید کو آرد پڑھا جائے۔

۴- بچہ اندیشہ ام از خاطر ناشاد روی + چہ بخاطر بگذارنم کہ تو از یاد روی (ص ۸)، بگذارنم کا حرف آغاز یعنی ب اپنی طرف سے اضافہ ہے، آگے چل کے الف بھی مؤخر مقدم ہوگیا ہے، اس لفظ کو گذرانم پڑھا جائے۔

۵- اے جنس وفا چوں تو متاع بجہان ست + عیب تو ہمین است کہ در کشور مائی (ص ۱۰)، پہلے مصرعہ میں متاع بجہاں نیست پڑھا جائے۔

۶- ع لذت از تیغ او دارم کہ چاک سینہ ام (ص ۱۰)، لذت کو لذتے پڑھا جائے۔

۷- بتمکینے غمش در دل نشستہ + کہ گر وصل آید از برنہ خیزد (ص ۱۱)، از اور بر کے بیچ میں جا کا اضافہ کیا جائے۔

۸- قاصد رقیب بود و من غافل از فریب (ص ۱۲)، بود اور "و" کے درمیان "ہ" بڑھا کے بودہ پڑھ کے وزن درست کرلیں۔

۹- یکبار آستان تو بوسہ دادہ ایم (ص ۱۲)، یا تو آستانہ تو پڑھیں یا آستاں اپنی جگہ رہے اور تو کو ترا پڑھا جائے دوسرے مصرعہ میں آستاں کا نون کاتب نے غائب کردیا جو ضروری ہے۔

۱۰- مادر خور فراغت وصل تو نیستم (ص ۱۴)، ما کے ساتھ ظاہر ہے نیستم صحیح نہ ہوگا۔

۱۱- در چمن بود زلیخا و بحسرت میگفت + یاد زنداں کہ در انجمن آرای ہست (ص ۱۵)، در اور انجمن کے بیچ میں و (=او) بڑھایا جائے (در وا انجمن آرائے ہست) ملاحظہ ہو سفینۂ حزیں "ش"۔

۱۲- صد بارہ از بزم تو گر رنجہ ردم باز ایم + کشش شوق بلا ئیست کہ من می دانم (ص)،

سو بار کے لیے صدرہ کافی ہے ناموزوں کرنے کے لیے "با" کا اضافہ ضروری نہیں۔

۱۳- چو آدمی بجہان نیست دل بمہر کہ بندم + کسے ز صفحہ خالی چہ انتخاب کند (ص ۱۶)، اگر آخری لفظ کند پڑھا جائے تو دونوں مصرعے دو الگ الگ بحروں میں جا پڑیں گے، کند کو نماید پڑھنا صحیح ہوگا۔

۱۴- بخفت خسرو مسکین دریں ہوس شبہا + کہ دیدہ بر سر پایت نہد بخواب رود (ص ۱۷)، پہلا لفظ نخفت پڑھا جائے اور دوسرے مصرعہ میں سر پا کی جگہ کف پا۔

۱۵- چو طفل مریضم بمہد زمانہ + بہر عضوے دردو گفتن ندانم (ص ۱۸)، دوسرا مصرعہ یوں پڑھیے: بہر عضو دردے و گفتن ندانم۔

۱۶- مباش در پے مرغے شکستہ پر صیاد + رسد بپائے گل گر بآشیاں نرسد (ص ۲۰)، پہلے مصرعہ میں مرغے کی "ے" ہٹا کے پہلے تو "مرغ شکستہ پر" پڑھیے، پھر دوسرے مصرعہ "بپائے گلے" پڑھیے، گل میں "ے" بڑھا کے۔

۱۷- چساں ہنم کہ مے راحتسب برخاک میریزد + کہ می لرزد دلم برگے کہ از تاک میریزد (ص ۲۰)، دوسرے مصرعہ میں برگے کے بعد کہ کو اگر پڑھیے۔

۱۸- نیازِ عاشقاں معشوق را درناز آورد + تو سرتاپا وفا بودی ترا من بیوفا کردم (ص ۲۳)، آورد جو پہلے مصرعہ کو غیر موزوں کر رہا ہے اسے میآرد پڑھا جائے۔

۱۹- گفتم بہ بلبل چکنم در فراق یار + از شاخ گل بخاک فتاد و طپید و مرد (ص ۲۴)، بلبل کو بلبلے پڑھنے سے پہلا مصرعہ موزوں ہو جائے گا، اس مصرعہ کے اولین الفاظ "گفتم بہ" کے بجائے "پرسم ز" پڑھیے۔

۲۰- بیابان بلا خارے ندارد + کہ از دامانِ من یاری ندارد (ص ۲۴)، اول تو خارے (مجہول) کا قافیہ یاری (معروف)، دوسرے پھر کھینچ تان کے مطلب نکالنا پڑا (یاری کا)...... "جو میرے دامن سے دوستی نہ رکھتا ہو" حالانکہ ذرا سا غور کر لینا تھا اور بات سمجھ میں آجاتی کہ داماں سے پہلے خار ہے تو بعد میں تار (دامن کا تار) یاری سے تو بہتر ہی ہے، (مطبوعہ نسخہ میں "یاری" کی جگہ "باری" بھی غلط ہے، چنانچہ مصرعہ یوں پڑھیے "کہ از دامان من تارے ندارد" قافیہ بھی صحیح ہو گیا۔

۲۱- محبت پس از قطع محبت لذتے دارد + کہ شاخ نخل پیوندی بہ از اول ثمر گیرد (ص ۲۴)، محبت اور پس کے بیچ میں کوئی دو حرفی لفظ چاہیے مثلاً "ہم" یا "خود"، ہم بہتر۔

۲۲- بندگی کیشم تمیز کعبہ و دیرم کجاست + دیدہ ام ہر جا درے انجام بجودے ساختم (ص ۲۵)، انجام کو آنجا پڑھا جائے۔

۲۳- بخت گر در خواب یک شب ہمدم یارم کند + دل طپد از ذوق چندانکہ بیدارم کند (ص ۲۵)، دوسرے مصرعہ میں "چنداں کہ" کو "چندانے کہ" پڑھنے سے مصرعہ موزوں ہوگا۔

۲۴- صد نامہ نوشتیم و جوابے نہ نوشتی + ایں ہم کہ جوابے نہ نویسد جواب است (ص ۲۵)، نویسد (واحد غائب) کو "نویسند" (جمع غائب) پڑھیے، بہ طور بیانیہ، کہ "لوگ جواب نہ لکھیں تو یہ بھی ایک جواب ہوا"۔

۲۵- عذرے ستمے ساخت کہ خوں در جگرم کرد (ص ۲۶)، "عذرے" کو "عذر" پڑھ لیں۔

۲۶- نہ نکہتے نہ گلے، نے خراش از خارے + دریں چمن بہ چہ دل خوش کند گرفتارے (ص ۲۶)، پہلے مصرعہ میں "خراش از خارے" کے مقابلے پر "نکہتے ز گلے" پڑھا جائے (نہ کانٹے کی کوئی خراش نہ کسی پھول کی کوئی خوشبو) جیسا کہ سفینۂ حزیں اور تذکرۂ سرخوش میں ملتا ہے (ش)، خراش کی جگہ خراشے پڑھیے۔

۲۷- حدیث عشق چہ داند کسے کہ در ہمہ عمر + بسر نکوفتہ باشد دو سرائے ترا (ص ۲۷)، دو کو "درِ" ("ِ" کی اضافت کے ساتھ) پڑھا جائے۔

۲۸- ولے کہ عاشق صابر بود مگر سنگ است + ز عشق تا بصبوری ہزار فرسنگ است (ص ۲۷)، کیا عاشق اور صابر کے بیچ میں "و" نہیں ہے؟ شعر تو بہت مشہور ہے، کام واؤ کے بغیر بھی چلے گا مگر مطبوعہ کلیات سعدی میں بھی واؤ موجود ہے۔

۲۹- گاہے ز دل بود گلہ گاہے ز دیدہ ام + من انچہ دیدہ ام از دل و دیدہ دیدہ ام (ص ۲۹)، (خریطہ میں دونوں مصرعے منقلب ہو گئے ہیں، مطبوعہ دیوان سلمان ساوجی ملاحظہ ہو)، دوسرے مصرعہ میں "از" کو "ز" پڑھ لیں تو موزوں ہو جائے گا، "از" کی جگہ "ز" پہلے مصرعہ میں ایک نہیں دو بار برتا گیا ہے، یہ اشارہ بھی آسانی سے دست یاب تھا۔

۳۰- اینم دیت بس است کہ ہنگام بازخوات + نعشم بر آستانۂ قاتل نہادہ اند (ص ۳۰)،
بازخوات کو "بازخواست" پڑھ لیں۔

۳۱- شداز اشکم رفتہ رفتہ دیدۂ گریاں سفید + میکند ابر سیہ را عاقبت باراں سپید (ص ۳۲)،
"از" کو تو "ز" پڑھ لیں، مصرعہ موزوں ہو گیا مگر ایک جگہ سفید ردیف موجود تھی تو دوسری جگہ سپید کرنے سے گئے رکعت کا ثواب تھا، دونوں لفظ صحیح، دونوں اچھے لگے، ایک جگہ سفید کر دیا ایک سپید۔

۳۲- زگردوں مرگ می خواہم حیاتی می دہد آرے + فلک ذنیساں لطفہاے بے محل دارد (ص ۳۲)، یاے مجہول استعمال ہو رہی ہے اس لیے حیاتی کو "حیاتے" پڑھ لیں اور دوسرے مصرعہ میں "ذ + نیساں" کو ملا کر "زیں ساں"۔

۳۳- چہ کنم حسرت پرواز گلستاں اے کاش + بگذارند کہ کنج قفس گرم کنم (ص ۳۴)،
قفس کو "قفسے" پڑھ کے شعر موزوں کر لیا جائے۔

۳۴- دل باآں دردنہ بندم کہ چوں زخم ہوس + بر در وصل بدریوزۂ درماں برسد (ص ۳۵)،
بندم کو "بندیم" پڑھا جائے۔

۳۵- پرستارے ندارم بر سر بالیں بیمارے + مگر دردم ازیں پہلو نہ آں پہلو بگرداند (ص ۳۵)، دوسرے مصرعہ میں "نہ" کو "بہ" پڑھ لیں تو معنی نکل آتے ہیں، نقطہ نیچے کے بجائے اوپر کتابت ہو گیا۔

۳۶- لائق مجلس نیم لیک از براے چشم زخم + شاخ خشکے تیز درکار است بستانِ ترا (ص ۳۷)، "تیز" کو "نیز" پڑھنے سے مہمل پن دور ہو جائے گا۔

۳۷- شبہاے ہجر را گذرانديم زندہ ایم + مارا بسخت جانیِ خود ایں گماں بندو (ص ۳۷)،
مصرع ثانی میں ظاہر ہے "بہ ن ود: ن ب ود (نبود) کی تصحیف ہے، مصرع اول میں "گذرانديم" کی جگہ "گذرانیدہ" پڑھیے۔

۳۸- ع ازازل صادق بہ دنیا میل میزش نداشت (ص ۴۱)، میل اور میزش کے بیچ میں "آ" بڑھایا جائے (آمیزش)۔

۳۹- ع مارا ز شب وصل چہ حاصل کہ تو از نازو (ص ۴۲)، ناز پر مصرعہ ختم ہونا تھا،

"واؤ" کاتب نے خواہ مخواہ بڑھا دیا۔

۴۰- باآنکہ صرف شد ہمہ عمرم در انتظار + آگہ نیم ہنوز کہ چشمم براہ کیست (ص ۴۳)،
ت ی م ظاہر ہے ن ی م (نیم) ہے، ایک نقطہ اور بڑھا کے کاتب نے اپنی کارستانی دکھا دی۔

۴۱- صیاد ما بناے ستم تازہ کردہ است + مرغے کہ پر شکستہ شود آزاد میکند (ص ۴۴)،
"شود" جو مصرعہ کو ناموزوں کر رہا ہے اسے "شد" پڑھا جائے۔

۴۲- برقع برافگندہ برد ناز بہ باغش + تا نکہت گل بیختہ آید بدماغش (ص ۴۴)،
برافگندہ معروف لفظ سامنے آ گیا اس لیے ناموزونیت کی طرف خیال نہیں گیا، موزوں ہو جاتا ہے اگر "برقع" برخ (بہ رخ) پڑھ لیں، برافگندہ صرف افگندہ رہ گیا۔

۴۳- ع کہ زہر کارگر ایست ارچہ در شکر باشد (ص ۴۵)، کارگر کے بعد "ایست" کی ضرورت نہ تھی ست یا است کافی بھی تھا صحیح بھی، ناموزونیت سے بھی بچا لیتا۔

۴۴- ع از رشک کہ سوزم زکہ پنہا کنمت ہای (ص ۴۶)، "پنہاں کنمت وای" پڑھا جائے۔

۴۵- خوش حال آنکہ ترا دید و جان سُپرد + آگہ نہ شد کہ ہجر کدام و وصال چیست (ص ۴۶)، پہلا مصرعہ یوں پڑھیں: خوشحال آنکہ دید ترا و سپرد جاں۔

۴۶- نومیدی از وصال تو طاقت گذار بود + صد جا گرہ زدیم امید بریدہ را (ص ۴۸)،
صحیح: طاقت گداز۔

۴۷- ع گوشۂ دامان مژگانے کہ اشک آسودہ نیست (ص ۴۸)، صحیح: آلودہ۔

۴۸- ع باصد کرشمہ آں بت بدست میرود (ص ۴۸)، "بدست" کے بجائے "بدمست" پڑھا جائے۔

۴۹- خزاں رسیدہ بوے بہار رفتہ ہنوز + ذخیرہ ہاے جنوں در دماغ دل دارم (ص ۴۹)، دماغ دل غالباً "دماغ می" ہوگا۔

۵۰- سر تا بقدم رفتہ بتاراج نگاہے + از چشم و دلم ماندہ ہمیں اشکے مرا آہے (ص ۴۹)،
دوسرے مصرعہ میں "مرا" کی جگہ "و" پڑھا جائے۔

۵۱- از فریب باغباں غافل مشواے عندلیب + پیش ازیں ہم دریں باغ آشیانے داشتم (ص ۵۰)، پیش ازیں من ہم: مصرعہ ثانی کے اولیں الفاظ میں من بڑھا کے موزوں ہو جائے گا۔

۵۲- عشق آں خانخاں خرابے ہست + کہ ترا آورد بخانۂ ما (ص ۵۱)، شاعر نے عشق کی صفت خانخاں خراب نہیں، خانخاں (خان وماں) خراب لکھی ہوگی۔

۵۳- ع برجگر تشنگی خضر و دلم میسوزد (ص ۵۱)، خضر کے بعد واؤ اڑا دیں " جگر تشنگی خضر پر میرا دل جلتا ہے" واؤ چہ معنی دارد۔

۵۴- ع ماراز خاک کویت پیراہن است درتن (ص ۵۲)، " کویت" کے نیچے خواہ مخواہ زیر بڑھا دیا۔

۵۵- ع خاطرم از پرشش الخ (ص ۵۲)، (پرسش کی سین کو بھی شین کر دیا)۔

۵۶- ع خونابۂ حسرت الخ (ص ۵۳)، خوں + آب = خوناب صحیح، خون + آب، خون + ناب = خوناب بایں معنی غلط۔

۵۷- لب بنداں دست در زیر زنخ دارد، مسیح (ص ۵۳)، زن خ (زنخ) کو" رن خ" کر دیا گیا۔

۵۸- ع ہر کس کہ زیر تیغ بہ رویت نگاہ نکرد (ص ۵۶)، پہلا" روی + ت = رویت، دوسرا نکرد صرف کرد ہوگا۔

۵۹- ہرگز مگو کہ کعبہ ز بتخانہ خوشتر است + ہر جا بود کہ جلوۂ جانانہ خوشتر است (ص ۵۳)، عرفی کے خوبصورت مصرعہ" ہر جا کہ ہست جلوۂ جانانہ الخ" کو خواہ مخواہ بگاڑ دیا۔

۶۰- ع ہزار شمع بکشتند انجمن باقیست (ص ۵۴)، انجمن سے پہلے واؤ بڑھایا جائے۔

۶۱- ع مبادا قدر و مردن ناشناسی دست میگرد (ص ۵۵)، یہاں قدر کے بعد واؤ بلا وجہ بڑھا دیا، اسے کاٹ دیا جائے۔

۶۲- خوش آں ساعت کہ میرفتی و طاقت می رسید از من + تغافل از تو می بارید و حسرت نی چکید از من (ص ۵۶)، می رسید کو می رمید پڑھا جائے اور اس کا قافیہ می چکید بجائے می چکد۔

۶۳- حسرت اینست کہ صیاد مرا جندانی + در قفس داشت کہ راہ چمن از یادم رفت (ص ۵۷)، صحیح" چندانے" کیوں کہ یائے معروف و یائے مجہول کا فرق اس کتاب میں برقرار رکھا گیا ہے۔

۶۴- ع دل کشید آ کہ یار است چہ می باید کرد (ص ۵۸)، اس قافیہ ردیف میں ص ۵۸ کے آغاز میں یہ پہلا شعر ہے مگر دوسرے شعر کو اس طرح لکھا گیا ہے کہ ردیف قافیہ والا مصرعہ پہلا مصرعہ کر دیا گیا، پہلے کو دوسرا ملاحظہ ہو:

فتنہ در چشم نگار است چہ میباید + یک گردش لیل و نہار است کہ من می دانم!! (ص ۵۸)

۶۵- پیش صیاد من بیدرد از بہر خدا ضامن شوید + یک پریدن تا سر دیوار می خواہد دلم (ص ۵۸)، " بیدرد" کا لفظ ختم کر دینے سے شعر یک بحری ہو جائے گا، یہ اضافہ کاتب کی طرف سے ہوا۔

۶۶- ع چہ بیدردانہ امشب دردل از یار میگفتم (ص ۵۸)، ایک دال کتابت میں رہ گیا،" دردِ دل" پڑھا جائے۔

۶۷- ع کرد تبسمے بمن رو بقفا کہ ایں چنیں (ص ۵۹)، (بقفا=بقفا)" ب ق ق ا" کو " ب ق ف ا" پڑھا جائے۔

۶۸- پا، در حریم محفل دلہا شمردہ اند + آہستہ باش، تا نہ زنی شیشہا بہم (ص ۶۰)،" اند" کو" نہ" پڑھیے پھر شعر کا لطف اٹھایئے، نہ : بمعنی رکھ۔

۶۹- یارانہ بار قیب بے گفتگو کنم + تا درمیاں تفصح احوال او کنم (ص ۶۱)، تفصح کو تفحص پڑھیے، حرف آگے پیچھے ہو گئے۔

۷۰- ع اے کاش خاک رہگذرے دوست بودمے (ص ۶۲)، صحیح رہگذر دوست۔

۷۱- عمرے گذشت و راہ سلامے نیافتیم + شرمندۂ دلم کہ چہا در خیال داشت (ص ۶۲)، دوسرے مصرعہ میں دلم ہے تو پہلے میں نیافتم ہی آ سکتا ہے، جمع متکلم غلط ہے، دلم کو دلیم پڑھ نہیں سکتے کہ مصرعہ ناموزوں ہو جائے گا۔

۷۲- بپاے شمع خود شاید کہ من ہم...... + زبان خویش اے پروانہ دستے بر سر من کن (ص ۶۲)، دوسرے مصرعہ میں زبان کو" ز + بال" اور کن کو" کش" پڑھیے۔

۷۳- زاہد اگر ز کردہ پشیماں نہ گشتہ است + در ہر نماز دست بزا تو چہ می زند (ص ۶۳)، دوسرے مصرعہ میں ظالمانہ طباعت رکتابت پھیل گئی ہے اور صحیح لفظ" بزانو" پڑھنے میں مانع ہے۔

۷۴-ع حسن سبز بخط سبز مرا کرد اسیر (ص ۶۴)، صحیح حسنِ سبزے۔

۷۵-عزت شاہ و گدا زیر زمیں یکسانست + منکند خاک برائے ہمہ کس جا خالی (ص ۶۴)، صحیح میکند۔

۷۶-ع بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست (ص ۶۵)، مشہور یوں ہی ہے مگر صحیح قرأت شیوہ ہست (ن م راخ ش)۔

۷۷-منادی میکند امروز زفار ہر زلفش + کہ بے ایماں بمیر د ہر کہ ایماں رانگہ دارد (ص ۶۷)، مصرعہ اول میں "ہر" مصرعہ کو ناموزوں کر رہا ہے اسے "سرِ" پڑھا جائے۔

۷۸-نمیدانم زمنع گریہ مطلب چیست ناصح را + دل ازمن دیدہ ازمن کنار ازمن (ص ۶۷)، مشہور شعر ہے، اس میں دیدہ ازمن کے بعد ایک ٹکڑا آستیں ازمن لکھنے سے رہ گیا۔

۷۹-غبارم کن، خدایا، درر ہے کاں ماہ می گذرد + کہ او دامن کشاں روزے مراز خاک بردارد (ص ۶۸)، مطلع میں قافیہ "بر، ردیف، دارد" پہلے مصرعہ میں غلط الفاظ یوں پڑھیے "کاں مہ گذر بردارد"۔

۸۰-ع غمہائے مردہ را و دل ما زندہ کرد ہجر (ص ۶۹)، را اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے کاتب نے، را کو اڑا کے پڑھیے "دلِ ما" کو "دلِ من" پڑھا جائے۔

۸۱-نالہائے تو گرفتاران غم را است + ورنہ ایں یک مشت پر مقصودِ صیادم نبود (ص ۶۹)، پہلے مصرعہ میں "تو" کو "تو" پڑھیے اور "غم را" کے بعد کے "است" کو "لذتیست" پڑھیے۔

۸۲-میدرد ہر دم گریباں فصیحیؔ ایں زماں + سالہا دستے کہ در دامانِ ننگ و نام و نمود (ص ۷۰)، نام کے ساتھ عام طور سے نمود بھی لکھ ہی دیتے ہیں، اس لیے اس شعر میں بھی کتاب یا مرتب کا قلم ادہر ہی چل گیا،" و + نمود" کی جگہ "بود" پڑھیے۔

۸۳-فریب سعی مخور کہ کعبۂ وصل + بدلنوازی پائے شکستہ می آید (ص ۷۰)، پہلا مصرعہ فی الحال ناموزوں ہے "فصیحی" تخلص بڑھایا جائے، اسی صفحہ پر اقبال کا جو شعر توضیحاً لکھا ہے اسے بھی بگاڑ کے لکھا ہے (حالانکہ شعر اردو کا ہے):

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ + کہ شکستہ تو، عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

پورے شعر میں "آئینہ" کو "آینہ" پڑھا جائے تو ناموزوں کلام موزوں ہو جائے گا، پہلے مصرعہ میں "ترآئینہ" کو "ترا آینہ" پڑھیے، دوسرے مصرعہ کے ابتدائی الفاظ یوں پڑھیے "کہ شکستہ ہو تو عزیز تر"۔

۸۴-ع دلا عذرت چناں ندا ہم کہ ہیچ از من نیا سودے (ص ۷۱)، عذرت کے بعد "چساں خواہم" پڑھیے۔

۸۵-ع کہ با نمک سرشتند خاک آدم را (ص ۷۱)، سرشتند کو "ب" + سرشتند = بسرشتند پڑھیے۔

۸۶-ع بہ بزمت اشک غیرم کشت و نتوانم کہ برخیزم (ص ۷۳)، اشک کو رشک پڑھیے۔

۸۷-ہر ہیچو ے جلوہ گریہائے تو حیف است + بگذار مرا تا بہ تمنائے تو میرم (ص ۷۳)، "بر ہیچو منے جلوہ" پڑھیے۔

۸۸-ع بخاطر نگذارم آرزوے وصل، میترسم (ص ۷۶)، (نگذارم = نگذرانم)۔

۸۹-ع میکنی بدنام اے قاصد چرا خوبے مرا (ص ۷۷)، (خوبے = خوب)۔

۹۰-ع نوشت اینکہ کہ شو صرف یار حابی (ص ۷۷)، "اینکہ" کے بعد "کہ" اڑا دیجیے، "شو" کو "شود" پڑھیے اور "یار" کے بعد "جانی" پڑھیے۔

۹۱-بمجلس تو چو آہے کشیدم از حسرت + بر آں شدی کہ نگاہے کنی مگر حیا نگذاست (ص ۷۸)، "مگر" اضافۂ کاتب / مرتب کو اڑا دیں اور آخر لفظ کو "نگذاشت" پڑھیں۔

۹۲-گر دست بمن زنند میرزد اشک + مانند درختہائے باراں دیدہ (ص ۷۹)، "میرزد" غلط "میریزد" پڑھا جائے۔

۹۳-ع نشد د زندگی، چوں از توقع، خار، خارِ من (ص ۸۰)، نشد کے بعد "د" کو دور پڑھا جائے۔

۹۴-دلہائے برشتہ شدہ فرش حرم او + اے اشک رواں شد کہ نسوز د قدم او (ص ۸۱)، دوسرے مصرعہ میں "شد" کو "شو" پڑھا جائے۔

۹۵-ہمتم ہست رسا نختم اگر کوتاہ است + پشت پائیم رسد از دست بدنیا نرسد (ص ۸۱)، "رسد" کے بعد "از" کو "ار" پڑھا جائے۔

۹۶- ع بروائے غم از دل کہ ترا ہم آزمودوم (ص ۸۳)، دل کے بعد من کا اضافہ کیجیے (دل من)۔

۹۷- ساز خموش تا من حسرت فزودہ را + گوید شنیدہ ام سخن ناشنیدہ را (ص ۸۴)، فزودہ کا قافیہ شنودہ پڑھا جائے (نہ کہ شنیدہ) {حسرت، حیرت تو نہیں؟ اصل دیوان دیکھا جائے۔[1]}

۹۸- در خواب ندیدہ بود میلی + آسودگی کہ در لحد دہد (ص ۸۵)، آسودگی کے نیچے اضافت سے کام تو چل جاتا ہے تاہم آسودگیٔ (ہمزہ + ی) یا آسودگی ی آسودگیے "آسودگی ے" بہتر ہوتا، آخری لفظ دہد کی جگہ دید پڑھا جائے۔

۹۹- ترسم ز بیوفائی خود منفعل شدی + گر کز تو امیدواری خویشتن بیاں کنم (ص ۸۵)، کز + تو، دونوں کو اڑا کر صرف از لکھا جائے، پہلے مصرعہ میں شدی کو شوی پڑھا جائے۔

۱۰۰- ع میروم از سر کوے تو ولے ہر گام (ص ۸۵) ولے اور ہر کے بیچ میں بر یا در بڑھانا ہوگا۔

۱۰۱- اگر ناخواندہ ایم بہ بزمت رو متاب از من + تو ہم دانستہ باشی از کمال اضطراب من (ص ۸۵)، پہلے مصرعہ میں "ایم" کو "می آیم" پڑھ لیں، دوسرے مصرعہ میں من کی جگہ "است ایں" پڑھا جائے۔

۱۰۲- چرا بیہودہ شادی در دل من خانہ میسازد + ہمیں دم سیل غم می آید و ویران میسازد (ص ۸۷)، خانہ میسازد (پہلا مصرعہ) کے بعد دوسرے مصرعہ میں ویرانہ (میسازد)، بالکل صاف بات تھی جسے ویران کر دیا گیا۔

۱۰۳- گیرم کہ ز قید قفس آزاد کنندم + کو قوت پرواز کہ توانم بچمن رفت (ص ۸۹)، مصرعہ کو موزوں پڑھنا ہے تو کہ کو ختم کر دیں۔[2]

۱۰۴- ع بگلشنم نفرستید تا بہار شود (ص ۹۰)، نفرستید کو مفرستید کیوں نہ پڑھیں۔

۱۰۵- ع دلم در دام مرغان قیامت الفتے دارد (ص ۹۰)

---

[1] خریطۂ جواہر میں حسرت ہی ہے اور شنیدہ دونوں جگہ دوسرے مصرعے میں "شنودہ" ہے۔ "ض" [2] خریطۂ جواہر میں مصرعہ ثانی اس طرح ہے ع کو قوت پای کہ توانم بچمن رفت، ص ۱۴۸ "ض"

۱۰۶- ما را دماغ گلشن و باغے نماندہ است + اے گل بروکہ دماغے نماندہ است (ص ۹۱)، مصرعہ ثانی میں اے گل کو اے بوے گل پڑھا جائے۔

۱۰۷- ع کہ گوید ناتوانے داشتم او را چہ پیش آمد (ص ۹۲)، کتابت میں داشتم کے شین کے تین نقطے رہ گئے۔

۱۰۸- چنانکہ سایہ شود محو در میان دو شمع + ز جا بروم چوں با آئینہ روبرو گردد (ص ۹۳)، دوسرے مصرعہ میں "بروم" کو "ب" کے بغیر "روم" پڑھ لیں اور "چوں" کو "چو"۔

۱۰۹- من کیستم کز ستم ہیچو توئی داد کنم + کہ کند حرف فراموش کہ فریاد کنم[1] (ص ۹۴)، پہلے مصرعہ میں کیستم کو کیم پڑھا جائے۔

۱۱۰- ع ہیچو داز مزمۂ مرغ گرفتار شدم (ص ۹۴)، ایک "ز" سے دو کا کام لے لیا گیا، کتابت میں "زمزمہ" کی "ز" رہ گئی۔

۱۱۱- تا کے اے دل فکر درد بے دوائے میکنی + از براے خود چہ کردی کز براے من کنی (ص ۹۸)، واقعہ اس شعر میں دوائے براے قوافی ہیں اور من کنی ردیف، پہلے مصرعہ میں شعوری کوشش کر کے "من کنی" کو "می کنی" لکھا گیا یعنی "میکنی" ملا کر لکھا گیا تاکہ کوئی گنجایش ہی نہ نکل سکے اور لطف یہ ہے کہ دوسرے مصرعہ میں صاف صاف الگ "من کنی" لکھا ہے۔

۱۱۲- ع ہمہ جور می ترستند و من از لطف بسیارش (ص ۹۸)، ترستند = ترسند۔

۱۱۳- پس از گل گر رود بلبل ز گلشن جاے اندازد + آں چشمۂ گل دیداست نتواند خزاں دیدن (ص ۹۹)، پہلے مصرعہ میں "جائے" کے بعد آں دارد پڑھیے، "اندازد" کے الف پر مد لگائیں، نون دال کو ملا دیں، "ز" کو "ر" کر دیں، اب صورت شکل میں سوائے مد کے "اندارد" اور "اندازد" ایک سے لگیں گے، لگتا ہے کاتب یا مرتب کو یہی التباس ہوگیا، آں دارد کی تصحیح "خریطہ" کے منسلک صحت نامہ میں موجود ہے۔

---

[1] اصلاح درست ہے مگر دوسرا مصرعہ بدل کیوں دیا گیا ہے، خریطہ جواہر مطبوعہ میں اسی طرح ہے جس طرح دارالمصنفین کی کتاب میں نقل ہوا ہے "کہ کند حرف مرا گوش کہ فریاد کنم" معلوم نہیں مرا گوش [illegible] فراموش کیسے ہوگیا۔ "ض"

۱۱۴- ز فرق تا بقدم ہر کجا می نگرم + ... جا اینجاست (ص ۱۰۱)، نظیری کا یہ شعر فارسی کے مشہور اشعار میں ہے، کاتب نے اس میں ''کجا'' اور ''می'' کے بیچ میں ''کہ'' چھوڑ دیا ہے، {ڈاکٹر ذاکر حسین نے ''کجا'' کے بعد ''نظر فگنی'' کو ترجیح دی ہے، ''بقدم'' کی جگہ ''قدمش'' کو بہتر خیال کیا ہے، (شروانی)} اس شعر کی یہ قرأت '' ز فرق تا قدمش ہر کجا نظر فگنی'' خود ایران کے مطبوعہ نسخہ میں بھی ملتی ہے مگر فٹ نوٹ میں '' ہر کجا کہ می نگرم'' بھی موجود ہے (ش)۔

۱۱۵- بعد مردن ایں قدر دانم کہ خواہی گفت حیف + ... نکرد (ص ۱۰۴)، مردن دراصل مرگم ہے، اگر مردن اور مرگم ایک ہی وزن میں ہیں جیسا کہ وہ ہیں تو شاعر اپنی مرگ (مرگم) کی بات کرے گا نہ کہ کسی کا بھی '' مردن''!

۱۱۶- کس را نہ بینم روز غم جز سایہ در پہلوے خود + آں ہم چو بینم روے تو گرداند، از من روے خود (ص ۱۰۴)، دوسرے مصرعہ میں دوسرا روے تو ٹھیک ہے (یعنی روے خود) مگر پہلے روے کو سوے پڑھنا ہوگا (یعنی سوے تو[1])۔

۱۱۷- بست است ہر دم سدرہ چشم سیاہش + خوں کردہ در بستہ نشست است نگاہش (ص ۱۰۵)، معمولی سی فروگزاشت ہے مگر اس کی جانب اشارہ شعر کو با معنی بنا دے گا یعنی کردۂ کو ''کردہ و'' پڑھ لیا جائے۔

۱۱۸- بیروں میا، ز خانہ کہ ذوق امید وصل + بہتر ز دیدنی ست بیہوشی (ص ۱۰۷)، بیہوشی (آخری لفظ) نے پھر آگے کچھ لکھنے ہی نہیں دیا، آخری الفاظ یوں ہونے تھے '' کہ بیہوشی آورد''۔

۱۱۹- سرشک از زخم پاک کردن چہ حاصل + علاجے بکن کز دلم خوں نہ آید (ص ۱۰۷)، ''زخم'' کی ''ز'' پر نقطہ لگا کر ایک (اپنی جگہ با معنی) نیا لفظ مہیا کر کے شعر مہمل کر دیا گیا، '' نہ آید'' = '' نیاید'' (خریطہ)۔

۱۲۰- وقت مردن چشم بکشا آنگہے رویش ببیں + راہ دوری میروی اندیشۂ زادے بکن (ص ۱۰۸)، صحیح قرأت یوں ہوگی کہ پہلے مصرعہ میں '' وا آنگہے سیرش'' ہو اور دوسرے مصرعہ میں '' بکن''، وقت مردن چشم بکشا وا آنگہے سیرش ببیں + راہ دوری میروی اندیشۂ زادے بکن۔

[1] جی نہیں سوے او۔ ''ش''

۱۲۱- بلبل گلشن پرستم می کنم پر باز نیست + باغ نزدیک است، اما طاقت پرواز نیست (ص ۱۰۸)، می کنم کو ''لیکنم'' پڑھا جائے۔

۱۲۲- جائے ہنوز نیست بہ ذوق دیار عشق + ہر چند ظلم ہست ہستم ہست داد ہست (ص ۱۰۹)، ہستم کو ''ستم'' پڑھ لیں، شعر موزوں بھی ہو جائے گا با معنی بھی، ہست کو '' نیست'' پڑھنا بہتر ہوگا۔

۱۲۳- ع زمین عشق پر وضع جہاں خوش خندہ با کردم (ص ۱۱۰)، پر کو ''بر'' پڑھیے۔

۱۲۴- چہ پیش آمد دلم را کز طپیدن باز بنشیند + چو مرغے کو بدام افتد از پرواز بنشیند (ص ۱۱۱)، افتد کو ''افتاد'' پڑھنے سے کلام موزوں ہو جائے گا۔

۱۲۵- ع داشتم در روے لہ تا اکنوں ز در ماں عار در شت (ص ۱۱۱)، صحیح قرأت '' داشتم دردے کہ تا اکنوں ز درماں عار داشت[1]''۔

۱۲۶- ہلاک میشوی اکنوں ولی نمی گفتم + مکش کہ جام فریب است تا چشیدہ باست (ص ۱۱)، نا چشیدہ میں نا کا نقطہ پھیل کے تا ہو گیا ہے، '' نا'' پڑھیے۔

۱۲۷- ع بہ تمنائے تو ترک جہاں کردو لی (ص ۱۱۱)، ترک - اور - جہاں کے درمیان میں '' دو'' بڑھائیے۔

۱۲۸- بمصلحت گلہ میکند ولی ز تیغ ستم + فدائے تست اگر صد ہزار جاں دارد (ص ۱۱۲)، '' ولی ز'' کے بعد تیغ کاٹ دیں تو مصرعہ موزوں ہو جائے گا[2]۔

۱۲۹- ایں شام ہجر بود ولی چوں بسر رسید + خاکت بسر کہ روز شدہ زندۂ ہنوز (ص ۱۱۳)، دوسرا مصرعہ یوں پڑھیں '' خاکت بسر کہ روز شد و زندۂ ہنوز''۔

۱۳۰- ع سوختی از رخ پردۂ شرم تراوا میکند (ص ۱۱۴)، تراوا = ترا وا یعنی '' ت ز ا + وا'' کو '' ت را + وا'' پڑھا جائے۔

۱۳۱- ز زخم تیغ نمیریم ولیک میترسم + کہ زندہ ماتم و گردی تو شرمسار از من (ص ۱۱۵)، مصرعۂ اول: نمیریم = نمیرم، مصرعۂ دوم: ماتم = مانم۔

[1] مطبوعہ نسخے میں '' کہ'' کی جگہ ''تو'' ہے۔ ''ش'' [2] مگر میرزا صاحب کی بیاض میں ''ز- تیغ'' اور '' ستم'' سب غایب ہیں اور مصرعہ یوں ہے، ع بمصلحت گلہ میکند ولی ورنہ (ص ۱۶۳)۔ ''ش''

۱۳۲- شرابخانۂ ما تا بحشر اگر کاوی + بجائے ریزۂ خم تو بہ شکستہ برآید (ص ۱۱۵)، پہلا مصرعہ بامعنی بھی ہے اور وزن میں بھی ہے مگر فی الحال دونوں مصرعوں کے دو مختلف وزن ہیں جب تک اگر کے بعد تو بکاوی نہ پڑھیں دوسرے مصرعہ میں ہمزہ کا استعمال توبہ پر کیا جائے نہ کہ شکستہ پر یعنی "توبۂ شکستہ"۔

۱۳۳- ع عیوضِ روز قیامت شب تنہائی را (ص ۱۱۶)، عیوض کو عوض پڑھا جائے۔

۱۳۴- امروز پرسشِ من کن بہ تکلف + کیں خستہ اگر دیر زید شام بمیرد (ص ۱۱۶)، "امروز" اور "پرسش" کے بیچ میں ایک لفظ "مگر" کے اضافہ سے شعر موزوں ہو جائے گا[1]۔

۱۳۵- بہنگام وداعش میکنم تو عہد دیریں را + جو بیمارے کہ وقت مرگ تجدید ایماں میکند (ص ۱۱۶)، پہلے مصرعہ میں "تو" کو "نو" پڑھیں، دوسرے مصرعہ میں "جو" کو "چو" پڑھیں اور "مرگ" کے بعد "ایماں تازہ میسازد"۔

۱۳۶- ع کے پس از مرگم چراغ بر سر گور آورد (ص ۱۱۷)، "چراغ" کو "چراغے" پڑھیے۔

۱۳۷- ع گر ز یر گلبنے فقسم رانمی نہی (ص ۱۱۸)، کاتب صاحب نے قفسم کے نقطوں کو آگے پیچھے کر دیا۔

۱۳۸- ع سخن گذشتہ گفتن گلہ دراز کردن (ص ۱۱۸)، "گذشتہ" کو "نگفتہ" پڑھیے[2]۔

۱۳۹- دل کہ بے عشق شود از رحمت حق دور شود + مردہ را موج ز دریا بکنار اندازد (ص ۱۲۰)، پہلے مصرعہ کا "شود" بدل کے "شد" پڑھا جائے تو مصرعہ موزوں ہو جائے گا۔

۱۴۰- آنکس کہ پا نہاد کوے سر نگذاشت + وآنکس کہ سر نہاد بپاے تو بر نداشت (ص ۱۲۱)، اس شعر کے قوافی سر - بر ہیں اور ردیف "نداشت"، پہلے مصرعہ میں نگذاشت کو نداشت پڑھیے اور نہاد کے بعد "بہ" اور کوے کے بعد "تو" بڑھایئے۔

۱۴۱- ناصح زباں کشود کہ تسکین ما دہد + نام تو برد باعث صد اضطراب شد (ص ۱۲۲)، "تسکین ما دہد" کو "تسکیں دہد مرا" پڑھیے۔

---

[1] اگر میرزا صاحب کے مجموعہ میں موزوں کرنے والا لفظ "دگر" ہے "ض" (ص ۱۲۶)۔ [2] یہ اصلاح درست نہیں، گذشتہ صحیح ہے البتہ گلہ اور دراز کے درمیان "را" چھوٹ گیا اور صحیح کا گلہ پر بنایا ہوا ہمزہ بھی غائب ہو جائے گا۔ "ض"

۱۴۲- نگہ بجانبِ من ہرگز از حیا نکنی + حیا کن زمن و شرم از خدا نکنی (ص ۱۲۳)، "حیا کنی" پڑھا جائے (دوسرے مصرعہ کے "حیا کن" کو)۔

۱۴۳- اے کہ از دشواری راہ فنا می ترسی + بسکہ آسانست ایں رہ مجو اں خوابیدہ رفت (ص ۱۲۳)، پہلے مصرعہ میں آخری الفاظ یوں پڑھیے "فنا ترسی مترس"۔

۱۴۴- من حرف ہم نشیں بعیث گوش کردہ ام (ص ۱۲۴)، بعیث کو "بعبث" پڑھا جائے۔

۱۴۵- کے ترک سجدۂ نوبت دلربا کنم + کارے کہ کافرے نکند من چرا کنم (ص ۱۲۴)، پہلے مصرعہ میں سجدۂ نو کو "سجدۂ تو" پڑھا جائے۔

پس نوشت

دارالمصنفین کا خریطۂ جواہر کا قلمی نسخہ دیکھا جائے ممکن ہے کثرتِ اغلاط کا سبب وہ نسخہ بنا ہو۔ شعرا کے ناموں کے اغلاط (مثلاً کلب حسین راغب کی تحریف کلن حسین)، ان کی وطنی نسبتوں میں تحریف، شعر اصلاً ایک شاعر کی ملکیت ہو اس کے بجائے دوسرے کو بخش دینا (مثلاً کارساز ما بفکر کار ما الخ، اصل مالک کامل خراسانی کے بجائے صاحب مثنوی سے منسوب کر دینا) ان امور کی طرف توجہ پھر کبھی۔

ہماری تصحیحات میں بعض جگہ زیادہ اختصار آ گیا ہے تاہم ان مختصرات کو جملہ بنا لینا دشوار نہ ہوگا، مثلاً نمبر ۴۶ "طاقت گداز صحیح" - کا مطلب یہ ہے کہ متن میں جو جلی لفظ "گذار" ہے، وہ "گداز" پڑھا جائے یا نمبر ۴۷ میں "صحیح: آلودہ" کا مطلب یہ ہے کہ متن میں جو جلی لفظ "آسودہ" ہے اسے "آلودہ" پڑھا جائے، متن کے آسودہ کو احتیاطاً جلی کر دیا گیا ہے، بلکہ اس خاص کیس میں اس کے نیچے ایک خط میں کھینچ دیا گیا ہے، ایک مثال اور نمبر ۱۱۲ "ترستند = ترسند" کا جملہ یوں بنے گا کہ "ترستند کو ترسند" پڑھا جائے (کھینچ کر)۔

تصحیح کے لیے پہلے تو شعر (یا صاحب مصرع سے کام چل سکا ہے وہاں مصرع) کا متن نستعلیق میں لکھ کر دوسری سطر میں تصحیح کی عبارت نسخ میں درج ہے۔

زیر تصحیح شعر کے اندراج کے بعد دارالمصنفین ایڈیشن کے صفحات کا حوالہ بریکٹ میں دے دیا گیا ہے، جہاں صفحہ نمبر رہ گیا ہے وہاں اس شعر نمبر سے پچھلے یا اگلے شعر نمبر کے صفحوں میں اسے

تلاش کیا جاسکتا ہے[۱]۔

دارالمصنفین نے "خریطۂ جواہر" مولفہ میرزا مظہر جانجاناں کا مکمل ایڈیشن تیار نہیں کیا بلکہ اپنے ذوق و ذہن کے مطابق جو جو اشعار پسند آئے انہیں نقل کر کے انکا ترجمہ اور کہیں کہیں تشریح و توضیح بھی کی ہے، نقل کرنے میں بہت سے اغلاط راہ پاگئے، جس نسخے سے نقل کیا یا تو وہ خود درست نہ تھا یا کاتب صحیح نہ لکھ سکے یا خود مرتب صحیح نہ پڑھ سکے، ہر سہ صورت میں شعر کا متن وہ نہ رہا جو واقعتاً ہونا چاہیے تھا اور جو متن اب ہے اسے دارالمصنفین ایڈیشن کے سوا اور کوئی مناسب تر نام دینا سمجھ میں نہیں آیا۔

اغلاط کی نشان دہی سے ایک مقصد تو یہ ہے ہی کہ دارالمصنفین سے اس کتاب کی اگلی اشاعت میں یہ کمیاں دور ہو جائیں، ساتھ ہی فارسی دنیا کو توجہ دلانا بھی اس تحریر کا ایک مقصد ہے، توجہ دلانا اس امر کی طرف کہ فارسی کی ایک اہم شخصیت کی ایک اہم تالیف، فارسی ادبیات میں جس کا ایک اہم مقام ہے، اس لائق ہے کہ جلد سے جلد اس کا ایک اچھا تنقیدی متن تیار ہو کے اشاعت پذیر ہو۔

خریطۂ جواہر کا مولف میرزا مظہر جانجاناں (نقش بندی مجددی صوفی ۱۱۹۵ھ) جس طرح شمالی ہند میں اردو زبان و ادبیات کے عہد اول کا ایک بڑا نام ہے، اسی طرح فارسی گویانِ ہند کی آخری بڑی صدی کا ایک محبوب دلآویز نام ہے اور اسی طرح فارسی بیاض داروں میں وہ ایک بلند مقام رکھتے ہیں، میرزا صاحب کی قیمتی میراث میں مختصر سا اردو کلام بھی ہے لیکن مشہور وہ اپنے فارسی دیوان کے لیے ہیں اور اتنی ہی شہرت ان کی بیاض "خریطۂ جواہر" کی ہے جو فارسی شعرا کے منتخب اشعار پر مشتمل ہے، میرزا صاحب عہد اول کے دو مشہور اردو شاعروں کے انعام اللہ خاں یقین اور عبدالحئی تاباں کے استاد تھے اور مشہور نقش بندی صوفی شاہ غلام علی کے مرشد، دو مشہور شاعروں میرزا رفیع سودا اور میر قمر الدین منت نے ان کی تاریخ وفات کہی: "عاش جمیداً مات شہیداً" (منت)

مظہر کا ہوا قاتل اک مرتد شوم اور اس کی ہوئی خبر شہادت کی عموم (سودا)

---

۱ صفحات درے دیے گئے ہیں۔ "ض"

تاریخ وفات اس کی کہی از روے درد سودا نے کہ ہائے جانجاناں مظلوم

دہلی میں چتلی قبر پر میرزا صاحب کی خانقاہ مدت تک مرجع خاص و عام رہی، علی بھائیوں، محمد علی شوکت علی نے بی اماں کی آخری آرام گاہ کے لیے اسی درگاہ کو چنا، ہمارے مخدوم زید ابوالحسن فاروقی مرحوم و مغفور اس درگاہ کے آخری خاندانی صاحب سجادہ تھے، اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔

اضافہ از "ش"۔ **حالی کے نزدیک خریطہ کی اہمیت** فارسی گو شعرا نے بھی سیکڑوں انتخابات کیے ہیں جو قدیم بیاضوں، سفینوں اور مجموعوں میں نظر آتے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے بھی وہ شہرت اور ناموری نہ حاصل کی جو ابو تمام کے حماسہ کو حاصل ہوئی اور جہاں تک میرا علم ہے بجز ایک "خریطہ جواہر" کے جو حضرت میرزا جانجاناں کا انتخاب ہے، کوئی اور ایسا مجموعہ معرض طبع میں بھی اب تک نہیں آیا ہے، "خریطہ جواہر" متوسطین اور متاخرین شعرا کے کلام کا بہترین انتخاب ہے۔

تقریباً تیس سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ مولانا الطاف حسین صاحب حالی مرحوم، اعلا حضرت غفران مآب میر محبوب علی خاں سابق والی ریاست کے جشن چہل سالہ کے موقع پر ان کے عہد کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے حیدرآباد بلائے گئے تھے اور سرکاری مہمان کی حیثیت سے نظام کلب میں مقیم تھے، مولانا کی آرام و آسائش کی نگرانی میرے سپرد تھی، اس لیے مجھے روزانہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہونا پڑتا تھا اور کبھی کبھی خود مولانا غریب خانہ پر تشریف لایا کرتے تھے، ایک دن مولانا مرحوم میرے یہاں تشریف لائے، "خریطہ جواہر" میز پر رکھا ہوا تھا اسے اٹھا کر ملاحظہ فرمانے لگے اور میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ دہلی اور لکھنؤ کے مذاق شاعری میں جو فرق ہو گیا، اس کے کیا اسباب ہوئے، میں نے عرض کیا کہ اسے بجز معاشری اور تمدنی ماحول کی تبدیلی کے اور کس چیز پر محمول کیا جاسکتا ہے، فرمایا کہ بے شک یہ بھی ایک سبب ہوا مگر سب سے بڑا سبب میرزا صاحب کا یہ انتخاب تھا، جو مدت دراز تک دہلی کے شعرا میں دائر و سائر رہا، اسی کا اثر تھا کہ وہ لوگ اساتذۂ فن کے جادہ پر چلے اور بے راہ روی سے محفوظ رہے۔

(تحریر: مسعود علی محوی، ۱۹۳۰ء، اقتباس: سفینۂ علی حزیں، تمہید: دار الطبع جامعہ عثمانیہ)

معارف: دارالمصنفین کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اس کی جو کتابیں آؤٹ آف اسٹاک ہیں اور عرصے سے شایع نہیں ہو رہی ہیں اور شائقین ان کی اشاعت کے لیے برابر اصرار کرتے رہتے ہیں، ان کو دوبارہ اہتمام سے چھاپا جائے، مولانا شبلی مرحوم کی اکثر کتابیں عرصے سے غائب تھیں اور جو چھپ رہی تھیں وہ پلیٹوں پر تھیں اور پلیٹیں اس قدر گھس پٹ گئی تھیں کہ چھپائی کی خرابیوں کے علاوہ ان میں بہت سی غلطیاں بھی در آئی تھیں، اس لیے طے کیا گیا کہ سیرۃ النبی ﷺ اور مولانا شبلی کی کتابوں کو ترجیحاً پہلے شائع کیا جائے۔

اسی کے ساتھ اسٹاک سے غائب ہونے والی تمام کتابوں کی ایک فہرست تیار کی گئی اور سب کی طباعت پر خرچ ہونے والی رقم کا ایک تخمینا تیار کیا گیا، چونکہ یہ ایک اضافی بوجھ تھا جس کا دارالمصنفین متحمل نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے دارالمصنفین کے شیدائیوں سے اپیل کی گئی، مگر عام علمی بدمذاقی کی وجہ سے یہ اپیل ناقابل التفات سمجھی گئی اور صرف سیرۃ النبی کی ساتوں جلدوں اور مولانا شبلی کی بعض تصانیف ہی کی طباعت کے لیے ان کے بعض عزیزوں اور قدردانوں نے تعاون کیا، پھر بھی ہم اپنی بساط کے مطابق یہ سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں اور کئی برسوں کے بعد اب اس قابل ہو سکے ہیں کہ مولانا شبلی کی اکثر تصانیف دارالمصنفین سے دست یاب ہو جائیں۔

صرف فارسی کتب کی اشاعت نو کا اعلان نہیں کیا گیا تھا البتہ ان کی اغلاط کی تصحیح کے لیے متعدد فارسی دانوں سے درخواست کی گئی مگر یہ درخواست بھی جب بے توجہی کا شکار ہو گئی تو شعرالعجم کے بعض حصے اور کلیات فارسی اپنے بعض دوستوں کی تصحیح پر اعتماد کر کے شائع کر دیے گئے اور جو رہ گئے ہیں وہ بھی جلد ہی چھپیں گے لیکن ظاہر ہے کہ یہ کتابیں فارسی زبان کے ماہرین کی تصحیح کے بغیر ہی شائع ہو رہی ہیں، اس لیے اغلاط سے خالی نہیں رہ سکتیں۔

ہم محترم نواب صاحب اور جناب عابد رضا بیدار صاحب کے بے حد شکرگزار ہیں کہ یہ دونوں حضرات دارالمصنفین کی محبت میں اس کی کتاب "خریطۂ جواہر" کی تصحیح کے لیے ہماری تحریک کے بغیر خود ہی آمادہ ہو گئے اور بڑی عرق ریزی اور جاں فشانی کے بعد یہ صحت نامہ تیار کیا ہے، فجزاهما الله خير الجزاء، لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں بھی ایک آدھ آنچ کی کسر

تو رہ ہی گئی ہے، مولانا شبلی کی کلیات فارسی اور شعرالعجم کی بیاض تو بیدار صاحب کی توجہ کی زیادہ مستحق تھیں کیونکہ مولانا ابوالکلام آزاد کے بہ قول میرزا غالب پر نہیں ہندوستان میں مولانا شبلی پر فارسی شاعری کا خاتمہ ہوا اور بیدار صاحب کے خیال میں شعرالعجم اردو کی سب سے بہترین کتاب ہے مگر وہ سب سے غلط چھپی ہوئی ہے، اب بھی وہ اس کی اور کلیات فارسی کی جانب توجہ فرمالیں تو اہل علم ان کے ممنون ہوں گے۔

دارالمصنفین میں خریطۂ جواہر کا کوئی قلمی نسخہ نہیں ہے بلکہ وہی مطبوعہ نسخہ ہے جو مطبع مصطفائی کان پور سے ۱۲۷۱ھ میں چھپا تھا، فاضل مرتب کے پیش نظر یہی مطبوعہ نسخہ تھا اور خاص میرزا صاحب کے کلام کے لیے بھی یہ اور میر غلام علی آزاد بلگرامی کی سرو آزاد ان کا ماخذ رہا ہے۔

خریطۂ جواہر کے مرتب اور دارالمصنفین بھی میرزا صاحب کے "بڑے نام" سے بہ خوبی واقف ہیں شاہ صاحب کی عظمت شناسی کا مظہر یہ کتاب بین ثبوت ہے، دارالمصنفین نے میرزا صاحب پر ایک مستقل کتاب بھی "میرزا مظہر جان جاناں اور ان کا کلام" کے نام سے شائع کیا ہے، اس کے علاوہ گل رعنا (مولانا حکیم سید عبدالحئی) یہیں سے شائع ہوئی ہے اور بیدار صاحب واقف ہوں گے کہ آب حیات میں مولانا محمد حسین آزاد نے میرزا صاحب کو مجروح کرنے یا کم از کم ان کے محاسن و کمالات کے اعتراف اور ان کے مقام و مرتبہ کے تعین میں جو زیادتی اور ناانصافی کی ہے، ان کی تردید کے لیے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔

ان سطروں کی کتابت ہو چکی تھی کہ محترم عابد رضا صاحب بیدار کا گرامی نامہ موصول ہوا، وہ فرماتے ہیں کہ شعرالعجم کے جو حصے نہیں چھپے ہیں اور ابھی ان کی کمپوزنگ نہیں ہوئی ہے یا ہو بھی چکی ہو تب بھی انہیں ان کے پاس بھیج دیا جائے تاکہ وہ ان کی تصحیح فرمادیں، ہم اس پیش کش کے لیے ان کے ممنون ہیں۔

*****

تہذیب اسلامی، حدیث، تصوف اور شاہ ولی اللہؒ

از:- جناب حیات عامر حسینی صاحب☆

(۲)

ایمان کی چوتھی قسم کو احسان سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ ایمان کے مقابلہ میں زیادہ واضح ہے، اس کی بنیاد اخلاص ہے جو ایک پوشیدہ امر ہے، اس کی کسوٹی اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت ہے، اخلاص کی گہرائی اور پاکیزگی اور اس کے ذریعہ پیدا ہونے والے اعمال اور کیفیات ہی ایک شخص کے ایمان کی ترجمان ہیں، ظاہر ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت جتنی سچی اور گہری ہوگی، اتنا ہی ایک شخص کا ایمان خالص اور اعمال صالح ہوں گے، اس کی عقل نفسانی خواہشات پر غالب ہوگی، وہ ان تمام اشخاص اور چیزوں سے محبت کرے گا جن سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے محبت کی اور ان تمام اعمال کو انجام دے گا جن کے کرنے کا حکم اللہ اور رسول ﷺ نے دیا ہے، اسے رسول ﷺ کی سنت سب سے پیاری ہوگی؛ اس کی ہر چیز اور عمل میں پاکیزگی ہوگی، اس کی پوری زندگی جہاد کی تصویر ہوگی، وہ جہاد بالسیف بھی کرے گا، جہاد باللسان بھی اور جہاد بالقلب بھی، وہ ان تمام اخلاق عالیہ کو اپنے اندر سمیٹنے کی کوشش کرے گا جن کا عملی اور مکمل نمونہ رسول ﷺ کی ذات مبارکہ ہے اور ان تمام برائیوں سے اجتناب کرے گا جن سے بچنے کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے لیکن اعمال کی یہ انجام دہی محض اصولوں اور قوانین کی پاس داری کے طور پر نہیں ہوگی، بلکہ ان کی بنیاد محبت الٰہی اور

☆ شعبہ فلسفہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ۔

عشق رسول ﷺ ہوگی۔

نیکی اور بدی وہ اعمال جن کے کرنے کا حکم اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے دیا نیکی (خیر) اور جن سے روکا وہ بدی (شر) ہیں اور ان کی اصل توحید اور نبی ﷺ کی تصدیق اور شرائع الٰہیہ کو تسلیم کرنا ہے۔

قرآن پاک میں ان کے لیے دو الفاظ معروف اور منکر آئے ہیں، معروف اور منکر کو اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کی اصل حیثیت اخلاقی بنتی ہے، کیونکہ قرآن پاک میں رسول اللہ ﷺ کی متابعت کے سلسلے میں جس لفظ کا استعمال ہوا ہے وہ ''اسوۃ'' ہے، اسوۃ زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہے، اسلام انسانی زندگی کے ہر شعبے میں اخلاقی برتری کا نفاذ چاہتا ہے، قرآن کے مطابق اخلاقی ترقی وتنزل کی بنیادوں پر ہی افراد واقوام کی ترقی یا تباہی کا فیصلہ ہوتا ہے۔

حضور ﷺ نے اپنے مشن کو بھی اخلاقی خوبیوں اور اچھے کاموں کی تکمیل فرمایا، حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: ''خدا نے مجھے اخلاقی خوبیوں اور اچھے کاموں کی تکمیل کے لیے بھیجا ہے''۔(۱)

آپ نے بلند اخلاق کو ایمان کامل اور اپنے سب سے زیادہ محبوب ان اشخاص کو قرار دیا جو اخلاق کے لحاظ سے سب سے اچھے ہوں اور آخرت میں سب سے وزنی چیز حسن اخلاق کو بتایا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے سب سے زیادہ مجھے وہ لوگ محبوب ہیں جو تم میں سے اخلاق کے لحاظ سے سب سے اچھے ہوں۔(۲)

بہترین اخلاق اعمال میں توازن کا نام ہے، کائنات کی ہر شے کے قیام اور وجود کے لیے توازن، تناسب اور اعتدال ضروری ہے، جب اور جہاں یہ چیزیں بگڑ جاتی ہیں وہاں پہ تباہی شروع ہوتی ہے، اسی لیے ہر متناسب، متوازن اور معتدل عمل خیر (Good) حسین (Beautiful) اور حق (Truth) ہے، یہ ساری صفتیں خدا کی ہیں، اسی لیے حدیث میں تخلقوا باخلاق اللّٰہ کی ہدایت آئی ہے، صحیح طرز اخلاق سے شادمانی ملتی ہے، یہ شادمانی، روحانی، ذہنی، قلبی، جسمانی اور جمالیاتی ہے، کیونکہ صحیح طرز اخلاق یا معروف فطرت انسانی کے مطابق

اور بدی اس کے خلاف ہوتی ہے۔

نیکی اور بدی کے سوال پر اسلامی مکاتب فکر میں بڑا اختلاف رہا ہے، معتزلہ کے مطابق جو بھی چیز عقل کے مطابق ہے وہ نیک ہے، ان کے خیال میں عقل ہر شے کی کسوٹی ہے، اشیا اپنے آپ میں نیک یا بد ہیں، انہیں شریعت یا وحی اچھا یا برا نہیں بناتی، لیکن وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ ایک ہی شے ایک زمانے میں حرام رہی اور دوسرے زمانے میں حلال، ظاہر ہے کہ عقل اس بات کا کیا فیصلہ کرے۔

اشاعرہ نے اس نکتۂ نظر کا ابطال کیا، ان کے مطابق چیزیں اپنے آپ میں اچھی یا بری نہیں ہوتیں، وحی یا حکم خداوندی انہیں اچھا یا برا قرار دیتی ہے، والدین کے چہرے پر محبت بھری نظر ڈالنا عبادت ہے لیکن غیر عورت کے سلسلے میں یہی عمل انتہائی برا ہے، وقت مقررہ پر نماز پڑھنا اتباع حکم خداوندی ہے، لیکن سورج کے طلوع یا غروب ہوتے ہوئے یہی عمل انسان کو آتش پرستوں کی صف میں کھڑا کر دیتی ہے۔

صوفیا کے نزدیک وہی عمل نیک اور وہی عمل بد ہے جسے شریعت الٰہی نے برا یا بھلا مانا، اب معاملہ ان اعمال کی انجام دہی اور اس کے مرتبہ و معیار کا ہے، زکوٰۃ عام مسلمانوں کے لیے نصاب کے مطابق ہے، لیکن صدیقین ہر شے کو اللہ کی راہ میں نثار کر دیتے ہیں، ان کے لیے زکوٰۃ ہر شے دے کر رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے۔

عدل ہر شے کا اپنے فطری تقاضوں کے مطابق استعمال عدل ہے، یہ اعمال میں توازن پیدا کرنے کا نام ہے، یہ ایک کائناتی عمل ہے اور اس کا متقابل ظلم ہے جو شیطان کا خاصہ ہے، خدا، کائنات اور اپنی ذات کے بارے میں مناسب، متوازن اور صحیح رویہ کا نام عدل ہے۔

ظلم توازن سے انحراف کا نام ہے اور اس کا نتیجہ انسان کی اپنے آپ پر ظلم سے شروع ہو کر تمام کائنات کو فساد سے بھر دینے پر منتج ہوتا ہے، ظلم انسان کو ان تمام صلاحیتوں، خصایص، خصائل، اعمال اور انعامات سے محروم کر دیتا ہے جو ملأ اعلا کے مشابہ اور رضا و دیدار خداوندی کے لائق بناتی ہیں، پیغمبران عظام کی بعثت کا بنیادی مقصد عدل کا ہمہ جہت قیام ہے، عدل انفرادی سطح پر بھی ہوتا ہے اور اجتماعی سطح پر بھی، زندگی کے ہر میدان میں عدل ترقی لاتا ہے اور ظلم زندگی

کے ہر میدان کو برباد کر دیتا ہے۔

وحدت انسانیت توحید اور رسالت کا لازمی خاصہ وحدت انسانی ہے، تمام انسان اللہ کی مخلوق اور آدم کی اولاد ہیں، پیغمبران عظام ہر انسان کے لیے ہدایت لے کر آئے، ان میں رنگ نسل، زبان اور جغرافیائی بنیادوں پر کوئی تفریق نہیں، سب انسان برابر ہیں، انسانوں میں دو ہی گروہ ہو سکتے ہیں، اچھے اور برے، یا مومنین اور کافرین اور یہ تفریق اعمال اور ایمان کی بنیاد پر ہے، صوفیا کی بنیادی تعلیمات کا اصل الاصول وحدت انسانی ہے، وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہر انسان ایمان اور اعمال صالحہ کے ذریعے اللہ کا نیک اور محبوب بندہ بن جائے۔

اخلاق و اقدار قرآن حکیم نے جو اخلاقی اصول اور اقدار عطا کی ہیں ان کا حقیقی نمونہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے، قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے کہ ”بے شک تم عظیم اخلاق کے مالک ہو“ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں، اسلام کا بنیادی مقصد اور اصول انسان کے اندر اخلاقی حس کو بیدار کر کے اسے کائنات میں خدا کا حقیقی خلیفہ بنانا ہے، یہ اخلاقی حس اسے تمام برائیوں سے روکتی ہے اور تمام بھلائیوں کو اس کے اندر جاگزیں کرتی ہے، قرآن پاک نے اعمال صالحہ کا عملی نمونہ رسول ﷺ کی ذات کو قرار دیا ہے، آپ ﷺ نے جن اعمال کے کرنے کا حکم فرمایا وہی اعمال صالحہ ہیں اور اعمال صالحہ ہی اخلاقی اقدار ہیں، یہ اقدار زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق ہیں لیکن ان کی بنیادی حیثیت اخلاقی ہے، کیونکہ اخلاقی اقدار کا زیاں یا فقدان ہی افراد اور اجتماع کو برباد کر دیتا ہے۔

امام غزالیؒ نے اخلاق اور فلسفہ اخلاق پر طویل بحث کی ہے، ہم اس کا ایک ہلکا سا خلاصہ سامنے لاتے ہیں تاکہ اس مسئلہ کو صحیح طور پر سمجھا جا سکے، یہ اس لیے بھی اہم ہے کہ امام غزالیؒ کے بعد آنے والے تمام صوفیا نے آپ کا تتبع کیا ہے۔

انسان کی تخلیق بامقصد ہے، وہ کائنات میں سب سے اعلا ہے اور اس کی تخلیق کا ایک اہم مقصد ان تمام اخلاقی اقدار کو حقیقت کا روپ دینا ہے جو اس کی فطرت میں ہیں، وہ اعمال جو اس کی روحانی اور اخلاقی ترقی کو جلا بخشتے ہیں، غزالیؒ انہیں فضائل یا منجیات کہتے ہیں اور وہ تمام اعمال جو اس کی روحانی و اخلاقی ترقی کو روکنے کا سبب ہیں اور جو اسے ہلاکت کی طرف لے

جاتے ہیں مہلکات یا رزائل ہیں، یہی بالترتیب اعمال صالحہ یا حسنات اور برے اعمال ہیں، سعادت اخلاق کا حصول کردار کی تعمیر کے بغیر ممکن نہیں، امام غزالی کے خیال میں ہر عمل کا ایک مقصد ہوتا ہے اور یہی مقصد اس کی سعادت کہلاتا ہے اور ہر خیر (نیکی یا عمل صالح) کی اصل فضیلت، اس کے اس کردار سے متعین ہوتی ہے جو وہ تقرب الٰہی کے حصول میں انجام دیتا ہے، انسان فرشتوں کے ہم پلہ ہوسکتا ہے، ان سے مرتبہ میں بڑھ سکتا ہے اگر اس کی عقل اس کی نفسانی خواہشات یا نفس کو قابو میں کرلے، یہ محاسن و معایب ہی ہیں جو انسانی کردار کو بناتے یا برباد کرتے ہیں، انسان کی دو حیثیتیں ہیں، ایک جسمانی اور دوسری روحانی، انسان یا اس کے کردار کی تعمیر تین قوتوں عقل، غضب اور شہوت سے ہوتی ہے، اخلاق حسنہ (یا باطن کی خوبصورتی جیسا کہ غزالی نے کہا ہے) ان قوتوں کے مناسب و متوازن استعمال یا کردار میں مضمر ہے، قوت عدل ان تین قوتوں کے درمیان تطبیق یا تناسب یا توازن پیدا کرتی ہے، اگر غضب اور شہوت کی قوت عقل اور شریعت الٰہی کی نگرانی میں رہے تو اخلاق یا کردار کی تعمیر ہوتی ہے، ان تین قوتوں کا باہمی اتصال اور متوازن عمل محاسن کو پیدا کرتا اور انہیں ترقی دیتا ہے۔

اخلاقی محاسن دو طرح کے ہیں، ایک وہ جو مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں جیسے خوف، صبر، پاکیزگی، اخلاق، غور و فکر و مراقبہ اور صدق اور دوسرے وہ جو مقصد کا ذریعہ بھی ہیں اور مقصد بھی جیسے توکل، شکر وغیرہ۔

ہر خیر کے تین ارتقائی منازل ہیں، علم، حال اور عمل، علم حقائق کا ادراک پیدا کرتا ہے اور قلب میں خوف خدا پیدا کرتا ہے، خوف توبہ، صبر اور پاکیزگی کو پیدا کرتا ہے اور اس طرح بندہ خدا کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے۔

صوفیا ہر خیر کو حال یا مقام کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، لیکن غزالی کے خیال میں خیر اعلا یا ادنی درجے کے ہوتے ہیں، حال یا مقام میں فرق مدارج کا ہے، نوع کا نہیں، کتاب اللمع میں حال کو ذہن کا نفسیاتی پہلو اور مقام کو اخلاقی ضابطہ کہا گیا ہے، توبہ، زہد، فقر، صبر، توکل اور رضا مقامات ہیں، تفکر، قرب الٰہی، محبت الٰہی، امید و شوق الٰہی، وجد احوال ذہنی ہیں، جب ایک خوبی نفس میں دائمی مقام پیدا کرتی ہے اور اس میں ہمیشہ رہتی ہے تو وہ مقام کہلاتی ہے اور اگر یہ وقتی

طور پر رہے اور پھر غائب ہوجائے تو یہ حال ہے۔

خیر یا نیک اعمال کو پانچ طبقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱-وہ خیر جو دنیاوی اشیا سے وابستہ ہو، جیسے توبہ، زہد، فقر، صبر۔

۲-جس کا تعلق دل کے حالات سے ہو، جیسے مراقبہ، محاسبہ، فکر۔

۳-جس کا تعلق ذہن و قلب کی یکسوئی سے ہے، جیسے نیت، اخلاص اور صدق۔

۴-جس کا تعلق انسان کے خدا سے تعلق سے ہے، جیسے خوف، رضا۔

۵-اور اعلا محاسن جو خدا سے محبت کو جلا بخشتے ہیں، جیسے شکر، توکل۔

معایب انسان کے فطری رجحانات کی غیر اخلاقی صورت پذیری کا نام ہے، یہ فطری رجحانات جب جب دنیا میں پھنس کر انسان کی روحانی ترقی کو روک دیتے ہیں تو یہ مہلکات بن جاتی ہیں اور ملاء اعلا اور انسان کے درمیان حجاب بن جاتی ہیں؛ دنیا کی محبت ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے، روحانی ترقی، تکمیل ذات اور حصول سعادت کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان رجحانات کو عقل کے تابع بنادیا جائے۔

معایب کی قسمیں یہ ہیں:

۱-جن کا تعلق جسمانی اعضا، جیسے پیٹ، زبان اور شرم گاہ سے ہے، جیسے حرام خوری، غیبت، جھوٹ، گالی گلوچ، زنا وغیرہ۔

۲-جن کا تعلق کسی مخصوص عضو سے نہیں، جیسے غضب، حسد وغیرہ۔

۳-جن کا تعلق صرف انسان سے ہے، جیسے کبر، عُجب، حبّ مال، حبّ جاہ وغیرہ۔

۴-جنہیں انسان شعوری طور پر کرتا ہے لیکن لاشعوری سطح پر اسے ان کا احساس نہیں ہوتا، جیسے غرور، ریا (۳)۔

نفس کی پہچان معرفت الٰہی کی نشانی ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آدمی چوپایوں، درندوں اور شیاطین کی عادتوں سے چھٹکارا نہ پالے، معرفت کے ذریعہ ہی وہ جانوروں، درندوں اور شیاطین کی سطح سے اوپر اٹھ کر اور بری خصلتوں یعنی معایب یا مہلکات کو زیر کرکے نیکی کا راستہ اختیار کرسکتا ہے، للّٰہیت یا الٰہیت اسی کا نام ہے، سعادت معرفت خداوندی ہے اور معرفت خدا اس کے

صفات کی معرفت سے ہوتی ہے اور یہ معرفت جسم کو دل کے ماتحت کرنے سے حاصل ہوتی ہے، اسی سے اخلاق حسنہ پیدا ہوتے ہیں اور اخلاق حسنہ کو پیدا کرنے والے افعال عبادت کہلاتے ہیں۔

تمام منجیات کو اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ بات اظہر من الشمس ہوجاتی ہے کہ یہ نیکیاں اپنے آپ میں وہ اعلا اعمال ہیں جو تمام روحانی، سماجی، سیاسی اور معاشرتی اقدار کو پیدا کرتی ہیں اور تمام مہلکات افراد سے شروع ہوکر اجتماع کے ہمہ جہت زوال اور بربادی پر منتج ہوجاتے ہیں، تمام منجیات کا عملی اور مکمل پیکر رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس ہے اور تمام مہلکات کا پیکر اور محور شیطان رجیم ہے۔

اس سے یہ باتیں سامنے آتی ہیں کہ:

۱-صوفیا کی تعلیمات اور اعمال کا ماخذ ومصدر اور محور آپ ﷺ کی ذات گرامی ہے۔

۲-اور تاریخ کے معروضی مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ صوفیائے اسلام کے خصوصی نظریات کی تشکیل خود ان کے اذہان کے اندر تلاوت قرآن وحدیث کی مداومت اور قرآن وحدیث میں تفکر اور نتیجے کے طور پر اندر ہی اندر رونما ہوئی، یہ بات تو حضرت جنید بغدادیؒ کے اس قول سے بھی واضح ہوجاتی ہے کہ ہم ایسے کسی تصوف کو نہیں مانتے جس کی بنیاد قرآن اور سنت رسول ﷺ نہ ہو۔

صوفیانہ اخلاق کے دو اصول اور مراحل ہیں:

۱-خوف وخشیت   ۲-اور محبت الٰہی

یہ دو اصول ایک شخص کو زہد، دنیا سے کنارہ کشی اور صبر وتوکل اور تسلیم ورضا کی زندگی گزارنے پر آمادہ کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں اس کے دل میں محبت الٰہی جاگزین ہوجاتی ہے، جس کا اظہار اس کے اعمال سے ہوتا ہے۔

محبت الٰہی اسے رضائے الٰہی اور رویت الٰہی کے قابل بناتی ہے۔

صوفیانہ اخلاق میں اعمال کی ظاہری حیثیت اور پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جاتا، لیکن زیادہ توجہ ان کے داخلی پہلو یعنی نیت کے اخلاص اور تطہیر قلب کی طرف ہوتی ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ظاہر وباطن کی تطہیر کرکے صوفی ہمیشہ یاد خدا میں محو رہے، اس کا ہر عمل اس کی یاد میں اور اس کی رضا کے لیے ہو، اس کے ساتھ قلبی وابستگی اور اس سے محبت بالآخر اسے خدا کی ذات

میں فنا کردیتی ہے، لیکن یہ فنائیت اس کی شخصیت کو منور اور روحانی طور پر بلند کردیتی ہے، ختم نہیں کرتی، وہ دنیا میں ہونے کے باوجود دنیا کا نہیں ہوتا، اس کے قلب اور روح سے سارے حجابات اٹھ چکے ہوتے ہیں، اسی چیز کو غزالی اور دوسرے تمام صوفیا نے کمال زہد کہا ہے۔

صوفیا کا پیش کردہ سارا نظام فلسفہ، ان کے نظام اخلاق پر استوار ہے، یہی ان کے متصوفانہ مابعد الطبعیات کو بھی سامنے لاتا ہے اور یہی ان کے سماجی فلسفہ کی تعمیر بھی کرتا ہے، ان کا فلسفہ اخلاق انفرادی تطہیر پر زیادہ زور دیتا ہے، اس کی واضح وجہ یہ ہے کہ وہ افراد کی تطہیر کرکے ایک اجتماعی نظام کو سامنے لانا چاہتے ہیں، کیونکہ ایک پاک اجتماعی نظام افراد کی تربیت اور تطہیر کے بعد ہی وجود میں آسکتا ہے، ایک پاک اجتماعی نظام کو جبراً نافذ نہیں کیا جاسکتا، یہ ایک ارتقائی اور تہذیبی اور تطہیری عمل کا متقاضی ہے، جب تک ایک شخص یا ایک جماعت ایک نظام اور اس کے اصولوں کو دل سے قبول نہ کرے اور اس کو اپنی زندگی میں نافذ نہ کرے اس کا اجتماعی وجود قایم نہیں ہوسکتا اور اگر جبراً ایسا کیا بھی جائے تو وہ زیادہ دیر تک قایم نہیں رہ سکتا، اس کی مثال اس درخت کی ہے جس کی جڑیں کاٹ دی جائیں اور اس کی ٹہنیوں پر پانی بہایا جائے۔

اسلام کا اجتماعی نظام تطہیر قلب، ایمان راسخ اور عمل صالح کی تین واضح بنیادوں پر قایم ہوتا ہے، اسلام یا اسلامی نظام کوئی نرا مادی نظام نہیں اور نہ اس کا تعلق انسان کی انفرادی یا محض اجتماعی نظام سے ہے جو صرف اس دنیا کی حدود تک محدود ہو، یہ تو ایک ایسا مکمل روحانی نظام ہے جو دنیا کو مزرعۂ آخرت قرار دیتے ہوئے افراد واجتماع کو تمام نظام وطریقہ ہائے زندگی کے ساتھ اس لیے تیار کرتا ہے تاکہ وہ لافانی فلاح وکامیابی یعنی رضا ودیدار الٰہی کے حق دار بن سکیں۔

اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ تصوف کی طرف کشش اصولاً ضمیر کے اس اندرونی احتجاج کا نتیجہ ہے جو معاشرتی بے انصافیوں کے خلاف کیا جاتا ہے، یہ احتجاج نہ صرف دوسروں کی بے انصافیوں کے خلاف ہوتا ہے بلکہ سب سے پہلے اور بالخصوص اپنی کوتاہیوں کے خلاف ہوتا ہے، اس خواہش کے ساتھ (جو تزکیہ نفس سے اور بھی قوی ہوجاتا ہے) کہ وصال باری تعالیٰ ہر ممکن وسیلے سے نصیب ہوجائے یہی نکتہ ہے جو حسن بصریؒ کی زندگی اور ان کے عبر ومواعظ میں واضح طور پر عیاں ہے(۴)۔

یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ تہذیب وتمدن کا سارا نظام اور سارے شعبے سیاسی نہیں

ہوتے، سیاست تو اس کا محض ایک حصہ ہے، بہترین اور عادلانہ سیاسی نظام ان افراد کے ذریعہ بہت اعلا خوبیوں کے ساتھ چل سکتا ہے، جن کا تزکیہ نفس ہوا ہو اور جو اسلامی آداب واخلاق سے نہ صرف واقف بلکہ اس پر عامل ہوں۔

طہارت اور تطہیر اور تزکیہ کا پورا عمل اسلامی تہذیب کی اساس ہے، تزکیہ حکمت اور تطہیر عمل اسلامی تہذیب کے تمام خدوخال اور کوائف کا مظہر ہے، یہ تہذیب توحید کے بنیادی اصول اور اس کے متقاضی لازمی روحانی عناصر پر قایم ہوتی ہے اور رسول ﷺ کے ان چار کارہائے منصبی کی عملی شکل اور پیش کار ہوتی ہے، جن کا ذکر قرآن یوں کرتا ہے۔

"اللہ نے اہل ایمام پر احسان فرمایا جب کہ ان کے اندر خود ان ہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور اس سے پہلے تو وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے" (۵)

اگر یہ ان اصولوں اور اقدار سے ہٹی ہوئی ہو یا ان پر استوار نہ ہو یا ان کی مبلغ اور شارح نہ ہو تو یہ تہذیب کیسے ایک اسلامی تہذیب کہلا سکتی ہے۔

تصوف کا بنیادی اصول تزکیہ اور تطہیر قلب ہے، یہی اصول سعادت اُخروی کی بنیاد ہے، تصوف اس حیثیت سے کہ اس کا سارا زور انسانیت کی تطہیر اور اس کی اُخروی کامیابی پر ہے، اسلامی تہذیب کا جزو لاینفک ہے، یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ بنو امیہ اور ان کے بعد کے جابرانہ سیاسی نظام نے اسلام کی تبلیغ وترویج نہیں کی، یہ کام صرف ان خرقہ پوشوں نے انجام دیا جنہیں ہم صوفیا کے نام سے جانتے ہیں۔

یوں اسلامی تہذیب وتمدن کی تعمیر اور اس کے جاری رہنے میں ان کا کلیدی کردار ہے، ایسا اس لیے ہے کہ انہوں نے رسول ﷺ کی سنن کو اپنے عمل سے زندہ رکھا اور اسے اپنی تبلیغ سے پھیلایا۔

حوالہ جات

(۱) شرح السنۃ (۲) ابوداؤد، ترمذی (۳) امام غزالی: احیا علوم الدین، جلد ۳، کیمیائے سعادت (۴) دائرہ معارف: دانش گاہ پنجاب، لاہور، جلد ۶ (۵) آل عمران: ۱۶۴

❀❀❀
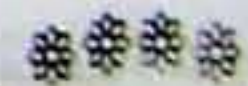
مشاہداتِ مصر

از:- پروفیسر محسن عثمانی ندوی☆

(۲)

مسجدوں کا شہر مساجد میں مسجد عمرو بن العاص اور مسجد احمد بن طولون مشہور ہے، یہ موخر الذکر مسجد ۲۶۵ھ میں بنی تھی اور امیر احمد بن طولون نے بنائی تھی، رفاعی مسجد اور جامع الحکیم یہاں کی بڑی مسجدیں ہیں، مسجد حسین بھی بڑی مسجدوں میں ہے جو فاطمی بادشاہ معزلدین اللہ کی بنوائی ہوئی ہے، بہت سی مسجدوں کا گنبد اور مینار اسلامی فن تعمیر کا شاہکار ہے، ان کے درو بام اور محراب غیر معمولی حسن رکھتے ہیں اور فن تعمیر کا نادر نمونہ سمجھے جاتے ہیں، بلو مسجد بھی اپنی تعمیری خصوصیات رکھتی ہے اور سیاح اسے دیکھنے آتے ہیں، سلطان ظاہر بیبرس کی بنائی ہوئی مسجد بھی بہت خوبصورت ہے، قاہرہ خوبصورت مسجدوں کا شہر ہے، یہاں کی خوبصورت مساجد کو دیکھنے کے لیے کئی دن کا وقت درکار ہے، مسجد حسین، مسجد زینب، مسجد سیدہ نفیسہ، مسجد امام شافعی وغیرہ بے شمار مسجدیں ہیں، اس کے علاوہ قلعہ محمد علی میں قلعہ سلطان صلاح الدین ایوبی میں بھی مسجدیں ہیں اور ہر مسجد یکتائے روزگار حسن تعمیر میں لاجواب، مصر کی مسجدوں میں قاہرہ میں بھی اور اسکندریہ میں بھی ایک بالکل الگ حصہ عورتوں کے لیے ہوتا ہے اور جلی حروف میں لکھا رہتا ہے "مصلی للنساء"، بلاشبہ عورتوں کی نماز گھر میں افضل ہے، حدیث میں ہے "فصلاۃ المرأۃ فی بیتھا خیر من صلاتھا فی المسجد" لیکن اگر کوئی عورت کسی ضرورت سے خریداری کے لیے بازار جائے تو کہاں نماز پڑھے گی اور جگہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ نماز نہیں پڑھے گی تو اس کا گناہ کس کے سر ہوگا، اس لیے بازار کی مساجد میں عورتوں کی نماز کے لیے ایک گوشہ ضرور متعین ہونا چاہیے،

☆صدر شعبہ عربی، سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجز، حیدرآباد۔

ہمارے ملک میں عورتوں کے سلسلہ میں بے جا سختی کی گئی ہے جس کا کوئی جواز نہیں ہے، عیدین میں تو عورتوں اور بچوں کو عید گاہ لے جانے کا حدیث میں حکم ہے اور بخاری شریف کی مضبوط روایت ہے، پہلے زمانہ میں شریعت کا کوئی حکم جاننے کے لیے لوگ پہلے کتاب اللہ اور پھر سنت رسول کا حوالہ دیتے تھے، پھر اجماع و قیاس کا نمبر آتا تھا، اب لوگ کتاب اللہ اور سنت رسول کو چھوڑ کر اپنے اپنے مسلک کے علما کے حوالے دیتے ہیں، گویا علما کا قول خدا اور رسول سے بڑھ کر ہے، عوام نہیں بلکہ علما سے یہ حرکت سرزد ہوتی ہے، لوگ مسلکی خول میں بند رہتے ہیں اور دوسرے مسلک کی دلیلوں کو سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے، اس شدت پسندی کا نام دین داری اور تقویٰ رکھتے ہیں۔

اہرام مصر اور ابوالہول

مصر کا اہرام دنیا کے عجائبات میں ایک ہے اور شہر سے کچھ فاصلہ پر واقع ہے، یہ قدیم زمانہ کی انجینئرنگ کا شاہکار ہے، مصر کے اہرام بادشاہوں کے مقبروں کے طور پر استعمال ہوتے تھے، مصر کے مختلف علاقوں میں چھوٹے بڑے اہرام پائے جاتے ہیں، ان کی کل تعداد اسی ہے جن میں سے بہت سے اب کھنڈر بن چکے ہیں لیکن وہ اہرام جو عجوبہ روزگار اور قدیم تعمیر کا شاہکار ہیں جیزہ کے علاقے میں واقع ہیں جو قاہرہ کے حدود میں داخل ہے، یہ اہرام سیاحت کا مرکز اور زیارت گاہ خلائق ہیں، یہ سب مخروطی شکل کے ہیں، یہ فراعنہ کے دور سے تعلق رکھتے ہیں، یہ دراصل بادشاہوں کے مقبرے ہیں، زیر زمین راستہ ہے اور وہ کمرے ہیں جہاں لاش خاص مسالہ لگا کر رکھی جاتی تھی تاکہ خراب نہ ہو، حضرت عیسیٰ سے ڈھائی ہزار سال پہلے ان کی تعمیر ہوئی تھی، ان میں جو الہرم الاکبر ہے، اس کی تعمیر فرعون خوفو نے کی تھی، پہاڑوں کے پتھر سے اس کی تعمیر ہوئی ہے، ہر پتھر ایک سے زیادہ ٹن کا ہے، جسمانی قوت کے اعتبار سے ایک کمزور انسان کی بساط کیا ہے لیکن عقل و ہنر کے سہارے وہ اپنے سے زیادہ وزن دار اور قوت دار چیزوں کو اسیر کر لیتا ہے، وہ سمندر پاٹتا ہے اور کوہ سے دریا بہاتا ہے، چاند اور سورج کی شعاعوں کو مسخر کرتا ہے، اس ہرم کی اونچائی ۴۸۱ فٹ تھی بعد میں اس کی اونچائی کچھ کم ہوگئی، پتھروں کے جوڑ کے درمیانی حصے نظر نہیں آتے ہیں، بیس لاکھ پتھر استعمال ہوئے ہیں، یہ اہرام ۱۳ ایکڑ کے رقبہ میں استادہ ہیں، اہرام کے اندر سے ایک سرنگ اوپر کی طرف چلی گئی ہے، یہ سرنگ

ہارون رشید کے زمانے میں دریافت ہوئی، سرنگ کی انتہا پر ایک ہال ہے، وہاں پر ایک حوض ہے جس میں بادشاہ کی لاش رکھی جاتی تھی، ہرم اکبر سے چھوٹا ہرم فرعون خوفو کے بیٹے شیفرن کا بنایا ہوا ہے، اس سے چھوٹا ہرم شیفرن کے بیٹے منکارا کا بنایا ہوا ہے، اہرام مصر سے شہر کا علاقہ نشیب میں واقع ہے اور یہاں سے شہر کا منظر نظر آتا ہے، اہرام جیزہ کے مشرق میں ابوالہول ہے جسے انگریزی میں sphinx کہتے ہیں، اس پر شیفرن (اصل نام خفرے) کا مجسمہ ہے، اس کا سر اور گردن زمین پر سے قابل مشاہدہ ہے، پہلے اس کا جسم زمین میں مدفون تھا، کھدائی کے بعد برآمد ہوا مجسمہ کی ناک تقریباً ۶ فٹ ہے، ہونٹ ۶ فٹ ہیں، اس کا بدن شیر کا ہے اور چہرہ انسان کا ہے، یہ قوت و جبروت کی علامت ہے، اس کے پتھر اسوان کے علاقہ سے لائے گئے تھے، اتنے بڑے پتھروں کا لانا اور نصب کرنا تعمیر کے مشکل کاموں میں سے ہے، اس کے قریب ایک قلعہ نما عمارت ہے جس میں بہت سے کمرے ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہ شہزادیوں کے رہنے کے کمرے تھے۔

بادلوں کی طرح ایک مہیب گڑگڑاہٹ

میں اہرام مصر کے پاس بیٹھا تھا اور شام کے سائے گہرے ہوتے جارہے تھے، اہرام کے سر شام کے دھندلکے میں ہولناک نظر آرہے تھے جیسے مردہ انسان کی کھوپڑیاں، پتھروں کے چھوٹے چھوٹے سلیب، بڑے بڑے دانت کی طرح معلوم ہونے لگے، ان کھوپڑیوں کے دانت اوپر نیچے، دائیں بائیں حرکت کرنے لگے، اس وحشت ناک سرسراہٹ سے ڈر محسوس ہونے لگا، میں نے خوف سے آنکھیں بند کرلیں، پھر ایک مہیب و عجیب لہجہ میں سخت اور کرخت آواز گونجنے لگی:

''میں فرعونوں کی بدروح ہوں اگرچہ پتھر ہوں، میں ہزاروں سال سے زندہ ہوں، میرا نام تمرد سرکشی اور نافرمانی ہے، موسیٰ کی پیغمبرانہ روح نے میری بدروح کو شکست دی تھی اور مجھے بحر احمر میں غرق کردیا تھا، لوگ میری لاشیں دیکھنے میوزیم جاتے ہیں، انہیں خبر نہیں کہ میں زندہ ہوں اور موسیٰ کی پیغمبرانہ روح، موحدانہ روح سے انتقام لے رہی ہوں، تم نے دیکھا ہوگا کہ موسیٰ کے رب کے الواح پر جو احکام لکھے ہوئے تھے انہیں ہر جگہ پامال کیا جارہا ہے اور پھر پیغمبر آخرالزماں کی تعلیمات کا کیا حشر ہورہا ہے، تم نے تو قاہرہ میں اور اسکندریہ میں یہ سب کچھ بہ چشم سر دیکھا ہوگا، ان کے ایک لاڈلے صحابی عمرو بن العاص نے ہمارے ملک کو فتح کرلیا تھا، تم نے دیکھا کہ میری

بدروح پُر فتوح پھر فتح یاب ہو رہی ہے، یہ اخوانی یہ انصار السنۃ کے لوگ یہ مذہبی گروہ ہمارے پایہ استبداد کے نیچے کچلے جارہے ہیں جیلوں میں بند کیے جارہے ہیں، ہم نے یہاں قرآن کے مفسروں کو اور دین کے خدمت گزاروں کو پھانسیاں دی ہیں، زمانہ کوئی ہو نام کسی کا ہو اصل حکومت تو ہماری ہے اور حکومت کے بدن میں روح تو ہماری جاری ہے، تم نے دیکھا ہوگا مصر کی سرزمین ہماری مشرکانہ تہذیب، ہمارے حجری اصنام پر آج فخر کر رہی ہے اور سیاحوں کو دعوت دید وشنید دے رہی ہے، ہمارے یعنی ہم فرعونوں کے اسٹیچو نصب کر رہی ہے اور اب ہر طرف ''نحن من ابناء الفراعنه'' (ہم فرعون کی اولاد ہیں) کا نعرہ بلند ہو رہا ہے لیکن شہر و بیاباں کی مسجدوں کے میناروں سے خدا کی کبریائی کا اعلان ''الله اکبر الله اکبر'' میرے لیے بہت روح فرسا ہے، میرا نشانہ ان اذانوں کو بے اثر کردینے کا ہے، تم جلد بہت جلد دیکھنا مسجد کے زیر سایہ خرابات کا منظر، ہاہاہاہا۔

میں نے آنکھیں کھولیں اور تیز تیز قدموں سے اہرام سے دور آبادی کے علاقہ میں آگیا۔

مسجد عمرو بن العاصؓ میں صدائے مینار

قاہرہ قابل دید تاریخی مقامات کا بہت بڑا سیاحتی مرکز ہے، ان مقامات میں مسجد عمرو بن عاص کو بڑی اہمیت حاصل ہے، بہت وسیع ہے اور قمقموں سے مزین ہے، عمرو بن عاص نے مصر فتح کرنے کے بعد یہ مسجد تعمیر کی تھی، پہلے زمانہ کے فاتحین کشور کشائی اور جہاں بانی کے لیے کسی ملک پر حملہ نہیں کرتے تھے، ان کا مقصود خدائے واحد کی عبادت ہوتا تھا، اسلام کی اشاعت ان کا مطمح نظر تھا، چنانچہ بہت سے فاتحین نے مسجد کی تعمیر کو تمام کاموں پر مقدم رکھا، اس مسجد کے منارے حضرت معاویہ کے زمانہ میں تعمیر ہوئے، پہلے مسجدوں میں منارے نہیں ہوتے تھے، یہ پہلی مسجد تھی جس کے مینار سے خدا کی کبریائی کا اعلان ہوا تھا، بعد میں اس مسجد کی توسیع ہوتی رہی، بڑے بڑے علما اور اتقیا اس مسجد میں علوم اسلامیہ کا درس دیتے رہے، درس کے بے شمار حلقے اس مسجد میں قائم ہوئے، یہاں دارالقضا بھی قائم ہوا، یہ مسجد عبادت گاہ بھی رہی اور تعلیم گاہ بھی اور عدالت گاہ بھی، گویا جامع ازہر سے پہلے علوم اسلامیہ کا درس یہاں سے دیا جاتا تھا، اگر اس کا نام درس گاہ رکھ دیا جائے تو امام لیث بن سعد اور امام شافعی، امام حجر عسقلانی اور شیخ الاسلام عزالدین بن سلام نے اسی درس گاہ سے فراغت حاصل کی تھی،

میں نے جمعہ کی نماز مسجد عمرو بن العاص میں پڑھی، اس مسجد میں بے شمار صحابہ کرام نماز ادا کر چکے ہیں، اس مسجد کی ہمیشہ توسیع ہوتی رہی ہے، شیخ اسماعیل الدفتار جمعہ کے امام اور خطیب ہیں، یہ ازہر کے کلیہ اصول الدین کے استاذ ہیں اور حکومت کی مجلس شوریٰ کے رکن ہیں، اس مسجد کے شمال مغربی جانب دریائے نیل بہتا ہے۔

مسجد میں ابھی خطیب کا خطبہ جمعہ شروع نہیں ہوا تھا، میں باادب بیٹھا تھا، سورہ کہف کی تلاوت میں نے ختم کی تھی کہ مسجد کے مینارے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مجھے دیکھ رہے ہیں اور زبان حال سے کچھ کہہ رہے ہیں، پہلے اہرام مصر کی بدروح نے اپنی بات مہیب لہجہ میں کہی تھی، اب اس مسجد کے مینارے روحانیت کی مشک بار فضا میں مجھ سے کہہ رہے تھے:

''سنو غور سے سنو، تم مہمان ہو، ہمیں معلوم ہے کہ تمہارے ملک اور تمہاری زبان کے شاعر نے یہ شعر کہا تھا

سنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشہ سیماب

تمہارے اس شاعر اقبال نے یہ بالکل درست بات کہی تھی، آج ہمارے منبر و محراب اس سجدہ کو ترستے ہیں جس سے روح زمیں کانپ جاتی تھی، وہ سجدہ جو سجدہ قربت ہوا کرتا تھا اور تمام دوسرے سجدوں سے انسان کو نجات دلاتا تھا، اب موجود نہیں، آج وہ دل ناپید ہے جو شوق شہادت سے سرشار ہو، اب لذت آشنائی نہیں، اب موت کے آئینہ میں رخ دوست دیکھنے والا اور دوست کے لیے جان کو نثار کرنے والا کوئی نہیں، اس مسجد کے بانی اور مؤسس صحابی رسول عمرو بن العاص نے اپنی تقریر میں مجاہدین اسلام سے کہا تھا'' واعلموا انکم فی رباط الی یوم القیامة لکثرة الاعداء حولکم و تشوف قلوبهم الیکم والی دارکم'' (یعنی تم ہمیشہ کے لیے سرحد کی نگرانی پر مامور ہو کیونکہ دشمن تمہارے بہت ہیں اور تمہاری تاک میں ہیں اور تمہاری سرزمین پر ان کی نظر ہے)، چودہ صدی پہلے کہی ہوئی وہ بات جو اس مرد جلیل کی زبان سے نکلی تھی آج بھی صحیح ہے، آج سرحدوں کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ مسلم ملک اسلحہ سازی کی صنعت میں خود کفیل ہوں اور مسلم ملکوں کے درمیان باہمی اتحاد و اعتماد موجود ہو، آج دنیا کی تمام

طاقتیں مسلمانوں کی حریف ہیں اور ان کی نگاہ حرص و آز ان کی زمین اور ان کے ملک کی طرف لگی ہوئی ہے، افغانستان میں کیا ہوا اور عراق میں کیا ہو رہا ہے، پورا عالم اسلام لہو کے سمندر میں غرق ہو چکا ہے، مسلم حکم رانوں کی زبان پر سکوت مرگ طاری ہے، کشتی گرداب میں پھنس چکی ہے، لوح مستقبل پر کوئی ایسا نقشہ جس میں عزت نفس ہو نظر نہیں آتا ہے نامرادی کا اندھیرا اور گہرا ہوتا جارہا ہے، خیمہ سروح کی طنابیں گرتی جارہی ہیں، مسلمانوں نے فاتح مصر کی اس نصیحت کی طرف توجہ نہ کی، اگر توجہ کی ہوتی تو آج فلسطین ہاتھ سے نہیں نکلتا، مسلمان جہاں گیر اور جہاں دار بن کر رہتے اور بڑی طاقت کے غلام اور غلامی پر نثار نہ ہوتے، عزت و آبرو خاک میں نہ ملتی اور اسرائیل تمہیں روندنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، تمہیں صرف بیرونی فوج کا نہیں بیرونی تہذیب کا بھی مقابلہ کرنا تھا لیکن تم نے ہتھیار رکھ دیے، کیا تم مصر کو اہرام مصر اور فرعون کے عہد کا مصر دیکھنا چاہتے ہو، کیا اسی کا نام ہے عزیمت، کیا اسی کو کہتے ہیں اسلاف کی عزت و ناموس کا خیال، اس مسجد کے دیوار و در اور منبر و محراب تمہیں ایک پیغام دے رہے ہیں، میرے اس پیغام کو اپنے ملک کے مسلمانوں تک اور جہاں جہاں تم ممکن ہو پہنچا دو، انہیں بتا دو کہ اب سائنس اور ٹکنالوجی صنعت اور اسلحہ سازی میں امریکہ اور یورپ سے بھی آگے ہو جانا خالص دینی اور شرعی اعتبار سے ضروری ہو گیا ہے، کیا سامان جنگ کی تیاری کے حکم خداوندی (واعدوا لھم ما استطعتم) کے بعد بھی اس میں کوئی شبہ ہے اور کیا اسلحہ کی صنعت جدید علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر حاصل ہو سکتی ہے اور کیا ان علوم میں کمال کے بغیر مسلمانوں کی ہزیمت اور رسوائی کے شرمناک سلسلہ کو روکا جا سکتا ہے؟

جاؤ اور اپنے ملک کے علمائے دین، مبلغین اسلام، ائمہ مساجد، واعظانِ شیوہ بیان، مسند نشینان حرم کو خبر کر دو کہ صحابی رسول فاتح مصر عمرو بن العاص کے الفاظ ''واعلموا انکم فی رباط الی یوم القیامۃ'' یعنی تم مستقل طور پر سرحدوں کی نگرانی پر مامور ہو آج بھی اس مسجد کی فضا میں گونج رہے ہیں، جب تک دنیائے اسلام اپنے گوش حق نیوش سے اس آوازۂ حق کی طرف متوجہ نہیں ہوگی اور جرم ضعیفی کو طاقت و قوت سے نہیں بدلے گی صحابی رسول کی روح بے قرار رہے گی اور اسی کے ساتھ عالم اسلام کی بے حرمتی بھی برقرار رہے گی وا اسفاہ لیکن اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو لا تقنطوا من رحمۃ اللہ وہ اپنی قدرت کاملہ سے حالات کو بدل سکتا ہے لیکن

اس کے لیے یقین محکم اور عمل پیہم کی ضرورت ہے، صبر واستقلال کی ضرورت ہے جاؤ کہہ دو کہ میرے اس پیغام کو اب منبر و محراب سے اور مسند درس سے نشر کریں''، خطبہ کی اذان شروع ہوتے ہی مینار کی آواز بند ہوگئی اور میں خطیب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

تاریخ کے دریچے سے

قاہرہ کا ایک تاریخی محلہ روضہ ہے، یہاں سے قریب ایک قلعہ ہے، حضرت عمرو بن عاص نے جب قلعہ پر حملہ کیا تو بادشاہ مقوقس نے قلعہ کے قریب جزیرہ میں پناہ لی تھی اور دریائے نیل سے ملا ہوا پل توڑ دیا تھا تاکہ وہاں تک اسلامی فوجوں کی رسائی نہ ہو سکے، جب بادشاہ کے سفیر صلح کی بات چیت کے لیے حضرت عمرو بن عاص کے پاس آئے تو انہوں نے دو دن کے لیے روکا، یہ سفیر جب واپس گئے تو انہوں نے اپنے تاثرات اس طرح بیان کیے کہ'' ہم نے ایک ایسی قوم دیکھی جس کی نگاہ میں موت زندگی کے مقابلہ میں زیادہ پیاری ہے، مسلمان سادگی پسند ہیں، ان میں تواضع ہے، دنیا کی حرص نہیں کرتے ہیں، آقا اور غلام میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے، سب بہت نماز کے پابند ہیں اور نماز خشوع سے پڑھتے ہیں''، مقوقس نے کہا ایسے لوگوں سے کوئی لڑ نہیں سکتا، یہ پہاڑوں کا مقابلہ بھی کر سکتے ہیں، مقوقس نے بہت بڑی رقم کی پیش کش کی تھی لیکن اقبال کے الفاظ میں'' ان پراسرار بندوں'' کے نزدیک دنیا اور اس کی تمام نعمتوں کی کوئی حیثیت نہ تھی اور سیم وزر کے انبار کو وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے، ان کے پیش نظر صرف آخرت کی سرخ روئی تھی، جب مسلمانوں کو ترغیب کے ساتھ یہ ترہیب بھی دی گئی کہ رومیوں کا لشکر جرار مقوقس کی مدد کے لیے آرہا ہے تو جواب یہ دیا گیا کہ اس بات سے ہمارے شوق شہادت میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے، مسلمانوں نے اسلام، جزیہ یا جہاد میں کسی ایک چیز کو قبول کرنے کی پیش کش کی، یہ اس دور کے لوگوں کا ایمان تھا اور یہ ان کے ایمان کی قوت تھی جس کے ذریعہ اپنے سے کئی گنا زیادہ طاقت ور فوج کا مقابلہ کر لیتے تھے، آج وہ ایمان کی قوت ہمارے اندر سے نکل گئی ہے جس کی وجہ سے ہم ہر محاذ پر ناکام ہیں اور رسوا ہو رہے ہیں اور مسلمان حکومتیں ڈر کی وجہ سے ظالم کا ساتھ دے رہی ہیں، اللہ نے مسلمانوں کو مقوقس سے جنگ میں کامیاب کیا تھا، آج ایمان کی کمزوری کی وجہ سے بش اور شارون کے مقابلہ میں شکست کھا رہے ہیں، نہ ایمان ہے نہ سامان ہے، کارگاہ زیست میں ہزیمت ہی ہزیمت ہے اور کہیں عزت نفس نہیں۔

سقوط غرناطہ و بغداد تاریخ میں پیش آیا تھا، اب پھر سقوط کابل و بغداد کا المیہ سر پر ہے، قافلہ لٹ چکا ہے، مسلمان شکستہ دل اور شکستہ حال ہیں۔

امام شافعیؒ کی قبر پر

حارۃ الشافعی میں امام شافعیؒ کی قبر ہے جس پر عمارت تعمیر کی جا چکی ہے، یہاں ایک وسیع مسجد بھی ہے، امام شافعیؒ کے نام سے ہر تعلیم یافتہ مسلمان واقف ہے، یہ امام مالکؒ کے شاگرد تھے لیکن ان کا فقہی مکتب فکر ہے جو دنیا کے بہت سے ملکوں میں مقبول ہے، امام شافعیؒ کے مزار کے قریب حضرت لیث بن سعد کا مزار ہے جو بہت بڑے فقیہ تھے، امام شافعیؒ ان کو امام مالکؒ سے بڑا فقیہ مانتے تھے لیکن کہتے تھے، ان کے شاگردوں نے ان کی فقہ کو محفوظ رکھنے کا انتظام نہیں کیا، اس کا مطلب ہے کہ کسی شخصیت کی عظمت کو زندہ اور تابندہ رکھنے کے لیے اسباب اختیار کرنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے ورنہ بڑی سے بڑی شخصیت کا چراغ گل ہو جاتا ہے، جیسے حضرت لیثؒ کا چراغ گل ہو گیا، وہ مال دار تھے لیکن کبھی زکوۃ ان پر فرض نہیں ہوتی، وہ سب مستحقین پر خرچ کر دیتے تھے اور بعض اوقات مقروض ہو جاتے تھے، یہیں کچھ فاصلہ پر شیخ الاسلام زکریا انصاریؒ کا مزار ہے جو بڑے محدث اور فقیہ تھے، ان کی جرأت کا یہ عالم تھا کہ جمعہ کے خطبہ میں وقت کے فرماں روا ملک اشرف پر اس کی موجودگی میں تنقید کرتے، بادشاہ ان کا معتقد تھا وہ کچھ نہیں کہتا، وہ تنقید سنتا اور ان کے ہاتھ کا بوسہ دیتا، یہاں سے کچھ فاصلہ پر عقبہ بن عامر صحابی رسول کا مزار ہے جو ایک چھوٹی سی مسجد میں واقع ہے، اس کے قرب و جوار میں بعض صحابہ کرام کی قبریں ہیں، فسطاط کا شہر اس کے قریب ہی موجود تھا، موجودہ قاہرہ کا مغربی علاقہ بعض فراعنہ مصر کا پایہ تخت تھا۔

میں نے مسجد امام شافعیؒ میں عشا کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی، نماز سے پہلے مجھے خیال آیا کہ جب امام شافعیؒ امام ابوحنیفہؒ کی قبر پر گئے تھے تو ان کے احترام میں ان کی مسجد میں حنفی فقہ اور مسائل کے اعتبار سے نماز ادا کی تھی، میں حنفی تھا لیکن مجھے شرم آئی کہ میں امام شافعیؒ کی مسجد میں امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق نماز پڑھوں، چنانچہ میں قرأت فاتحہ خلف الامام اور آمین بالجہر اور رفع یدین کے التزام کے ساتھ نماز ادا کی کہ اس مسجد کے ادب کا یہی تقاضہ تھا، ہمیں اس بات کا احساس تھا کہ جو رواداری اور ایک دوسرے کا ادب و احترام ائمہ کرام میں پایا جاتا تھا وہ

اب ان کے متبعین میں نہیں پایا جاتا ہے، اب ظرف دل کی کشادگی ختم ہو چکی ہے، عصبیت اور مسلکی تشدد کا غلبہ ہو گیا ہے جو صحت مند شعور کی علامت نہیں ہے،، امام شافعیؒ کا فقہ میں اپنا اسکول ہے، دنیا میں لاکھوں کروڑوں انسان ان کی اتباع کرتے ہیں لیکن امام شافعیؒ کے دل میں امام ابوحنیفہؒ کا جو احترام تھا اس کا اندازہ امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں ان کے شعر سے ہوتا ہے:

أعد ذكر نعمان لنا ان ذكره هو المسك ما كررته يتضوع

یعنی نعمان (امام ابوحنیفہؒ) کا ذکر بار بار میرے سامنے کرو، اس کا ذکر اس مشک کی طرح ہے جسے الٹنے پلٹنے سے اس کی خوشبو اور بھی پھیلتی ہے۔

مسجد امام شافعی سے باہر نکلنے کے بعد چند قدم کے فاصلہ پر حضرت وکیعؒ کی قبر ہے جو امام شافعیؒ کے استاذ تھے، اپنے وقت کے فاضل یگانہ اور ورع و تقوی میں بہت ممتاز تھے، فاتحہ پڑھی اور وہ عربی کے اشعار یاد آئے جس میں امام شافعیؒ نے اپنے استاذ کا عقیدت کے ساتھ ذکر کیا ہے، انہوں نے اپنے استاذ وکیعؒ سے سوئے یادداشت اور حافظہ کی کمزوری کی شکایت کی، حضرت وکیعؒ نے جواب میں گناہوں سے بچنے کی تاکید کی اور کہا کہ علم نور الٰہی ہے اور نور گناہ گار کو نہیں بخشا جاتا ہے:

شكوت الى وكيع سوء حفظى فاوصانى الى ترك المعاصى
فان العلم نور من الـه وان النور لا يعطى لعاص

جامع ازہر میں

قاہرہ کتابوں کا بہت بڑا مرکز ہے، یہاں بہت سے کتب خانے ہیں، دار المعارف نے ہزاروں کتابیں شائع کی ہیں، شہر کی اہم قابل دید جگہ ازہر ہے، ازہر کے قرب و جوار کے علاقے گھنی آبادی کے علاقے ہیں، جیسے دہلی میں جامع مسجد کا علاقہ یا ممبئی میں محمد علی روڈ، جامعۃ الازہر عظیم الشان یونی ورسٹی ہے، اس کی ابتدا مسجد سے ہوئی جو جامع ازہر کہلاتی ہے، اس کی تعمیر ۳۶۱ھ میں فاطمی حکومت کے زمانہ میں ہوئی، اس میں تین منارے ہیں اور وسیع کشادہ صحن ہے، بیسویں صدی میں اسے باقاعدہ یونی ورسٹی کی حیثیت دے دی گئی، اب اس کے لیے بہت سی عمارتیں بن گئی ہیں، اب تعلیم جامع ازہر کے بجائے جامعۃ الازہر میں ہوتی ہے لیکن بعض شیوخ اب بھی مسجد میں درس دیتے ہیں اور یہ درس رواق عباس میں ہوتا ہے، اس طرح ازہر کی قدیم روایات باقی ہیں،

جامعۃ الازہر کے عصری علوم کے نئے کالج قاہرہ مدینۃ النصر میں ہیں، جامعۂ ازہر کی عظیم الشان لائبریری ہے جس میں تقریباً ایک لاکھ کتابیں ہیں، پندرہ ہزار مخطوطات ہیں، لائبریری کی ایک شان دار عمارت ہے جو مشیخۃ الازہر سے متصل ہے، جامع ازہر کے عقب میں بیس پچیس کتابوں کی دکانیں ہیں ان کے علاوہ شہر میں کتابوں کی دکانیں مکتبے بہت ہیں، جامع ازہر کا اپنا میڈیکل کالج اور اسپتال بھی ہے، ازہر کے کلیۃ اللغۃ العربیۃ کے ڈین اور وکیل سے ہماری ملاقات ہوئی، کلیۃ اصول الدین میں پی ایچ ڈی کا مناقشہ ہو رہا تھا جس میں تھوڑی دیر شرکت کا موقع ملا، شیخ الازہر اس وقت محمد سید طنطاوی ہیں، ان سے ملاقات کا پروگرام تھا لیکن وہ سعودی عرب گئے ہوئے تھے، مشیخۃ الازہر کی عمارت جس میں شیخ الازہر کا آفس ہے بہت شان دار ہے، اس عمارت میں داخل ہوتے ہی ایک بورڈ نظر آیا جس پر مکتب اشتہار الاسلام لکھا ہوا تھا، اندر داخل ہوا تو دیکھا کئی افراد جو یورپ کے باشندے تھے قبول اسلام کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے، ایک رومانیہ کی خاتون کو کلمہ پڑھایا جا رہا تھا، تلقین کے بعد ان کو انگریزی میں اسلام کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی جا رہی تھیں، معلوم ہوا کہ روزانہ اوسطاً دس افراد اسلام قبول کرتے ہیں اور ازہر کی طرف سے یہ اس کا باقاعدہ آفس ہے، اسلام قبول کرنے والوں کو ضروری لٹریچر فراہم کیا جاتا ہے، اس عمارت سے متصل مفتی الدیار المصریہ کا آفس ہے، اس وقت ملک میں سب سے اہم شخصیت مفتی الدیار المصریہ کی ہے اور یہ دکتور علی جمعہ ہیں جو ملک کے سرکاری مفتی عام ہیں، فقہ اسلامی ان کا اختصاص ہے، تقریباً آدھے گھنٹے تک ان سے ملاقات ہوئی اور وہ ہندوستان کی اسلامی شخصیتوں اور دینی اداروں کے بارے میں سوال کرتے رہے اور میں انہیں تفصیلات سے مطلع کرتا رہا، انہوں فتاوی کی سی ڈی بھی تحفتاً عنایت کی۔

قاہرہ یونی ورسٹی (جامعۃ القاہرہ) میں

قاہرہ یونی ورسٹی جدید انداز کی یونی ورسٹی ہے، اس یونی ورسٹی کو دیکھنے میں کئی گھنٹے کا وقت صرف ہوا، وائس چانسلر سے ملاقات کی جن سے پہلے سے وقت لیا گیا تھا، ان کا نام دکتور عبداللہ التطاوی ہے، ہندوستان میں عربی زبان کی تعلیم و تدریس اور اس کے مسائل پر گفتگو ہوئی، انہوں نے کہا ہندوستان کی جامعات سے طلبہ یہاں پڑھنے کے لیے آسکتے ہیں، ان کو وظائف بھی دیے جاتے ہیں، عربی زبان و ادب میں داخلے کے لیے

جامعاتی سطح پر اتفاق نامہ بھی ہوسکتا ہے، انہوں نے لائبریری دکھانے کے لیے دکتور نصر منصور کو فون کیا جو چیف لائبریرین تھے اور رہبری کے لیے ایک اسکالر کو ساتھ کر دیا، ہم نے ان کے ساتھ کلیۃ الآداب، کلیۃ الآثار، کلیۃ الحقوق (لا کالج)، کلیۃ العلوم (سائنس فیکلٹی)، کلیۃ الاعلام (میڈیا اینڈ کمیونیکیشن فیکلٹی) اور دار العلوم وغیرہ کی زیارت کی، دار العلوم عربی زبان و ادب کی خدمت کا بہت بڑا مرکز رہا ہے اور مشہور ادیب یہاں سے پڑھ کر نکلے ہیں، شیخ محمد عبدہ کا ایک قول نقل کیا جاتا ان اللغۃ العربیۃ تموت فی کل مکان و تحیی فی دار العلوم یعنی عربی زبان و ادب کہیں زندہ رہے نہ رہے دار العلوم میں زندہ رہے گی، دار العلوم کا اپنا کتب خانہ بہت اچھا ہے، دیواروں پر مصر کے مشہور ادبا اور شعرا کی تصویریں لگی ہوئی ہیں، ایک لاکھ بیس ہزار طلبہ قاہرہ یونی ورسٹی میں پڑھتے ہیں، طالبات کی تعداد ۶۵ فی صد ہے، قاہرہ یونی ورسٹی کی لائبریری بہت شان دار ہے، اس کے مختلف شعبوں کو تفصیل سے دیکھنے کا موقع ملا، ایک بہت بڑا ہال تھا جس میں صرف پی ایچ ڈی اور ایم فل کے مقالے رکھے ہوئے تھے، ایک سیکشن مخطوطات کا تھا، مطبوعات کا سیکشن پانچ منزلہ ہے۔

قاہرہ کا میوزیم

قاہرہ کا میوزیم مصر کی سات ہزار سالہ تہذیب کی زندہ یادگار ہے، اسے انیسویں صدی میں ایک فرانسیسی ماہر آثار قدیمہ نے ۱۸۵۸ء میں قایم کیا تھا، فراعنہ مصر اور رومن عہد کے بے شمار آثار اس میوزیم میں موجود ہیں، عجائبات و آثار جو اس میوزیم میں ہیں ان کی تعداد ایک لاکھ ہے، سیکڑوں مجسمے، تصویریں، آثار قدیمہ، ہزاروں سال پرانے برتن اور استعمال کی دوسری چیزیں، مشرکانہ عبادت گاہوں کے معبود، فرعونوں کی لاشیں، گھروں کے دروازے اور روز مرہ استعمال میں آنے والی چیزیں، لکڑی کی نقش کاری، سنگ تراشی، سوز کاری، قدیم تہذیبوں کے رسم خط اور نقوش و خطوط، زیورات اور آرائش و زیبائش کے مختلف قدیم سامان سب اس میوزیم میں عبرت کے لیے قابل مشاہدہ ہیں، تاریخ میں نئی تہذیبیں اپنا رنگ جماتی رہیں اور قدیم تہذیبوں کے رنگ و آہنگ مٹتے گئے، قومیں اٹھیں، عروج و اقتدار تک پہنچیں اور پھر خاک میں مل گئیں، ان کا نام و نشان مٹ گیا، تاریخ ان کے بعد دوسری قوموں کے ابھرنے نکھرنے اور سنورنے اور کمال تک پہنچنے کی داستان سناتی ہے، پھر ان کے اضمحلال اور پھر

زوال اور آخر میں کارزار زیست سے فنا اور انتقال کی خبر دیتی ہے۔

رنگ جما کے اٹھ گئی کتنے تمدنوں کی بزم یاد نہیں زمین کو بھول گیا ہے آسماں

قلعہ صلاح الدین ایوبی

شہر کی تاریخی یادگاروں میں سور العیون بھی ہے، یہ دیوار سلطان صلاح الدین ایوبی نے بنائی تھی تاکہ دریائے نیل کا پانی رہٹ کے ذریعہ قلعہ تک پہنچ سکے، دیوار کے اوپر ایک پتلی نہر بنائی گئی جس سے پانی قلعہ تک جاتا تھا، اسی کے قریب سلطان کا قلعہ ہے جو جبل مقطم پہاڑی پر واقع ہے، ۵۷۲ھ میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے یہ قلعہ بنایا تھا، اس کی مسجد بہت خوبصورت ہے جو محمد علی پاشا نے بنوائی تھی اور اس کا طرز تعمیر استنبول کی مسجدوں سے بہت مشابہ ہے، جو دیکھنے میں ایک قلعہ کے مانند ہوتی ہے، جن میں فاتحانہ جلال ہوتا ہے، یہ دیوار قلعہ بہت بلندی پر واقع ہے اور دیکھنے والوں کو چڑھائی سے گزرنا پڑتا ہے، پہلے اس قلعہ میں سرکاری دفاتر ہوا کرتے تھے اور فوجی چھاؤنی کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا، اب آثار قدیمہ کی حیثیت سے مرکز سیاحت ہے، سلطان صلاح الدین ایوبی کی قبر دمشق میں ہے، سلطان صلاح الدین ایوبی اور نور الدین زنگی نے تاریخ میں اپنی سادگی، جفاکشی، دین اسلام کے لیے غیرت وحمیت اور صلیبی فوجوں کے خلاف جہاد اور مسجد اقصی کو دشمنوں کے ہاتھ سے چھین لینے کی وجہ سے شہرت حاصل کی ہے، سلطان کی یاد آج بھی مسرت انگیز اور دل کو گرما دینے والی ہے، آج فلسطین کا قضیہ سلطان صلاح الدین کو آواز دیتا ہے

اے سوار اشہب دوراں بیا اے فروغ دیدہ امکاں بیا

علامہ بدر الدین عینی اور حافظ ابن حجر کی قبر پر

شہر میں جامع ازہر کے پاس ایک مسجد جامع الحسین مشہور ہے، فاطمی خلفا حضرت حسینؓ کا سر دمشق سے یہاں لے آئے تھے اور وہ سر یہاں مدفون ہے لیکن یہ روایت بہت زیادہ قابل اعتبار نہیں، یہ دنیا کتنی ناقابل اعتماد ہے، یہاں کی ہر شئی فانی ہے، نواسۂ رسول ﷺ کے سر کے بارے میں بھی کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ کہاں مدفون ہے، انبیائے کرام کی قبروں کا بھی پتہ نہیں، جن انبیا کی قبروں کے بارے میں جگہوں کی تعیین کی جاتی ہے ان کے بارے میں بھی کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں، صرف سنی سنائی باتیں ہیں، جامع الحسین سے ایک راستہ تنگ وتاریک گلیوں سے ہوتا ہوا جامع الحاکم تک جاتا ہے، ایک گلی

کے آخری سرے پر ایک چھوٹی سی مسجد ہے، یہ مسجد الحافظ الحجر کہلاتی ہے، اس مسجد میں حافظ ابن حجر کا درس ہوتا تھا، حافظ ابن حجر کی قبر حضرت عقبہ کے مزار کے سامنے ایک چھوٹے سے کمرے میں واقع ہے، حافظ ابن حجر محدث تھے اور بخاری کے شارح تھے، شرح کا نام فتح الباری ہے، اس کے علاوہ نخبۃ الفکر اور لسان المیزان اور متعدد کتابوں کے وہ مصنف ہیں، جامع ازہر کے عقب میں ایک مسجد ہے، اس مسجد میں علامہ بدر الدین عینی کا مزار ہے، ان کا مدرسہ بھی تھا، یہ بھی شارح بخاری ہیں لیکن حنفی المسلک ہیں، ان کے اور علامہ ابن حجر کے درمیان معاصرانہ چشمک بھی تھی، ابن حجر شافعی تھے اور علامہ عینی حنفی، علامہ ابن حجر کی طرح یہ بھی کثیر التصانیف بزرگ ہیں۔

اسکندریہ میں

مصر میں اسکندریہ کا ساحل اپنے حسن سحر انگیز کے لیے مشہور ہے، یہ شہر بحر متوسط کے کنارے واقع ہے، یہ قاہرہ سے ۲۲۵ کیلومیٹر دور شمال مغرب میں واقع ہے، اس شہر کو اسکندر مقدونی نے ۳۳۲ قبل مسیح بسایا تھا، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب مصر فتح ہوا تو مقوقس یہاں کا بادشاہ تھا اور اسکندریہ اس کا پایہ تخت تھا، اسکندریہ چھ مہینہ میں فتح ہوا، حضرت عمرو بن عاصؓ نے چھ مہینہ تک یہاں کے قلعے کا محاصرہ کیا، آخر میں حضرت زبیر فصیل پر سیڑھی لگا کر اوپر چڑھ گئے، پھر دوسرے صحابہ کرام بھی چڑھ گئے اور اس طرح سے اللہ نے فتح عطا فرمائی، قاہرہ جس جگہ آج ہے وہاں بھی فوجی قلعہ تھا جب یہ دونوں قلعے فتح ہوگئے تو ملک مصر مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا، قاہرہ ایک باقاعدہ شہر کی حیثیت سے بہت بعد میں صلاح الدین ایوبی کے عہد سے ابھرا، اسکندریہ کی تاریخ ایک شہر کی حیثیت سے قاہرہ سے کہیں زیادہ قدیم ہے، یہ یونانی علوم کا مرکز رہا ہے، یونان کے بعد رومی تہذیب کے وارث ہوئے، یونان کا علمی سرمایہ بھی رومیوں کی طرف منتقل ہوگیا، یہاں ایک کتب خانہ تھا جو تیسری صدی قبل مسیح میں قائم ہوا تھا، مسلمانوں پر الزام ہے کہ انہوں نے اس کتب خانہ کو جلا دیا تھا، علامہ شبلی کا ایک تحقیقی مقالہ اس موضوع پر ہے جس میں دلائل کے ساتھ اس الزام کا غلط ہونا ثابت کیا ہے، تاریخ میں الوہیت مسیح سے متعلق بڑے بڑے مناظرے عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے مابین اس شہر میں ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے عیسائی اور چرچ دو نیم ہو کر رہ گئے، یہاں کی مشہور تاریخی لائبریری عیسائیوں کی خانہ جنگی میں چوتھی صدی عیسوی میں ضائع ہو چکی تھی جب مسلمانوں نے فتح کیا تھا، اس وقت یہاں کوئی

لائبریری نہیں تھی، لائبریری اور میوزیم کا دوبارہ احیا ہوا اور مختلف ملکوں کی مشترکہ کوششوں سے ایک عظیم الشان لائبریری قایم ہوئی اور اسی کے ساتھ ایک میوزیم بھی، اس لائبریری کی عمارت بہت شان دار ہے اور جن ملکوں نے اس کے احیائے جدید میں حصہ لیا ہے ان کی زبان کا ایک ایک لفظ یا جملہ دیوار پر کندہ کر دیا گیا ہے۔

یہاں ساحل سمندر پر واقع پارک بہت مشہور ہے، یہاں ایک گریگ رومن میوزیم ہے، شہر کی ہوا روح پرور اور موسم سہانا ہے، مصطفیٰ کامل کا مقبرہ یہیں ہے، ملک فاروق کا محل یہیں ہے، یہاں خوبصورت مسجدیں بھی ہیں اور تاریخی میوزیم بھی ہیں، میوزیم آف فائین آرٹس بہت مشہور ہے، مسجدوں میں ابوالعباس مسجد اہم ہے جس کے قریب صاحب بردہ حضرت بوصیریؒ کا مزار ہے اور قطبے کا قلعہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے، یہاں یونی ورسٹی بھی ہے اور یونی ورسٹی کی لائبریری بھی ہے، اسکندریہ ریلوے اسٹیشن سے دو تین کیلومیٹر کے فاصلہ پر مسجد دانیال ہے، اس مسجد میں ہم نے ظہر کی نماز ادا کی، اس مسجد کا نام مسجد دانیال اس لیے ہے کہ یہ حضرت دانیالؑ کی طرف منسوب ہے، یہاں ایک تہ خانے میں دو قبریں ہیں، ایک قبر حضرت دانیالؑ کی اور دوسری لقمانؑ کی بتائی جاتی ہے، ہم نے عشا کی نماز مسجد بوصیری میں پڑھی، عاشق رسول ﷺ شاعر نعت حضرت بوصیریؒ کی قبر پر فاتحہ پڑھی اور قاہرہ واپس جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن واپس آگئے۔

شام کا وقت اسکندریہ کے ساحل دیکھنے میں گزرا تھا جو مغربی ملکوں کے سیاحوں سے بھرا ہوا تھا، میں بہت دیر تک ایک چٹان کے کنارے کھڑا رہا اور بحر متوسط کی موجیں میرے قدموں کو چھو رہی تھیں اور پتھروں سے ٹکرا کر ہزاروں سفید موتیوں کی شکل میں بن بن کر بکھر جاتی تھیں، ہوا تیز چل رہی تھی اور سمندر بہت متلاطم تھا، نہ جانے کتنی کشتیاں اس بے کراں سمندر میں ڈوبی ہوں گی، گرد و پیش کی چٹانوں نے بھی یہ منظر دیکھا ہوگا لیکن طوفان صرف پانی کا نہیں ہوتا ہے اور کشتیاں صرف لکڑی کی نہیں ہوتی ہیں اور ڈوبنے والے صرف گوشت و پوست کے انسان نہیں ہوتے ہیں، تصورات کی بے کراں موجیں مجھے بہا کر ہندوستان لے گئیں، طوفان نظریات اور خیالات کا بھی ہوتا ہے، مجھے یاد آیا کہ ابھی ہندوستان میں عمرانہ کے مسئلہ پر میڈیا نے ایک طوفان اٹھا دیا تھا۔

حنفی فقہ کے لحاظ سے ایک عورت جسے اس کے سسر نے ہاتھ لگایا ہو، اپنے شوہر کے لیے

حرام ہو جاتی ہیں، حنفی علما کچھ بھی کہیں کسی ایک بھی غیر مسلم کا ذہن اس فتویٰ سے متفق نہیں ہو سکتا تھا کہ بے قصور عمرانہ، پانچ بچوں کی ماں اپنے شوہر پر حرام ہوگئی، جو لوگ اسلام اور مسلمانوں کے ازلی دشمن ہیں ان کا شرارت کے ساتھ شور و ہنگامہ تو اس فتویٰ کے خلاف تھا ہی مسلمانوں کے ہمدرد غیر مسلموں کے ذہن کو بھی مطمئن کرنا مشکل تھا، انگریزی اخبارات کے مضامین سو فی صدی اس فتویٰ کے خلاف تھے، اسلامی شریعت کی غلط تصویر برادران وطن کے سامنے آرہی تھی جوان کو اسلام سے دور اور متنفر کر رہی تھی، علما اس پہلو پر غور نہیں کر سکے، ایسے موقعہ پر عقل و دانش کا اور حکمت دعوت دین کا تقاضہ یہ تھا کہ دوسرے ائمہ فقہ کے مسلک کو سامنے لایا جاتا اور اس کو بھی اسلامی شریعت کی حیثیت سے پیش کیا جاتا اور اس پر غور و فکر کر لیا جاتا، ان کے پاس اپنی مضبوط دلیلیں تھیں اور ان کی فقہ بھی شریعت کا حصہ تھی اور ہے لیکن برا ہو مسلکی تشدد اور تعصب کا کہ مسلمان ایسا نہیں کر سکے، اسکندریہ کے ساحل پر متلاطم سمندر کو اور ہندوستان سے روانہ ہونے سے کچھ پہلے پرسنل لا کے خلاف طوفان کو دیکھ کر اقبال کا یہ شعر زبان پر آیا

نہ جانے کتنے سفینے ڈبو چکی اب تک   فقیہ و صوفی و ملا کی ناخوش اندیشی

شہر خموشاں میں

قاہرہ کے محلوں سے گزرتے ہوئے کئی بار قبرستانوں سے گزرنا ہوا اور خیال آیا نہ جانے کتنے علما اور صلحا اس کی خاک میں دفن ہیں، رفیق سفر اور رہنما ساتھیوں نے بتایا کہ یہاں کے قبرستان ہمارے ملک کے قبرستانوں سے مختلف ہیں، میں نے جھانک کر دیکھا تو بہت چھوٹے چھوٹے بنے ہوئے مکانات جن کی چھتیں بہت نیچی تھیں نظر آئے، معلوم ہوا کہ ان مکانات میں تیار شدہ کمرے ہوتے ہیں اور ہر کمرے میں دو تین جگہیں لاش رکھنے کی بنی ہوئی ہوتی ہیں، لاش رکھ دی جاتی ہیں اور باہر سے تالا بند کر دیا جاتا ہے، ایک خاص مدت کے بعد لاش کی ہڈیاں کنارے کر کے اس کی جگہ دوسری تازہ لاش رکھ دی جاتی ہے، غالباً فرعونوں کے زمانے سے یہاں جو طریقہ چلا آرہا ہے اسی کی اس رواج میں جھلک ہے، ہمارے ملک میں قبر کو بند کر کے مٹی ڈالنے کا رواج ہے، اس کا فائدہ بہت ہوتا ہے اور بہ قول شاعر دنیا سے جانے والے لالہ و گل میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔

❀❀❀❀

رام پور کا

ایک ادبی رسالہ نیرنگ

از:- جناب عتیق جیلانی سالک☆

رسالہ "نیرنگ" کے بانی سعید اللہ خاں عیشؔ گھیر ملکیان کے ساکن اور محافظ خانہ فوج داری میں ملازم تھے (۱)، انہوں نے اپنے مطبع سعیدی سے مشاہیر عصر منیر شکوہ آبادی، امیر اللہ تسلیم، احمد علی شوق قدوائی (جو اس وقت رام پور میں سکونت پذیر تھے) کی تصانیف شائع کیں، اپنے گھر کی ماہانہ طرحی نشستوں کی روداد اپنے گل دستوں تصویر مشاعرہ ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء، خیابان سخن ۱۹۰۸ء اور خیر مقدم (سنہ اشاعت نامعلوم) میں شائع کرتے تھے، نیرنگ کی سرگذشت گل دستہ تہذیب ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء سے شروع ہوتی ہے، جس کا باقاعدہ نام رکھنے کے لیے پروفیسر سید اولاد حسین شاداں (متوفی ۱۹۲۳ء) کی صدارت میں میٹنگ ہوئی، ایک تجویز مطبع سعیدی کی مناسبت سے "سعید" اور دوسری تجویز "سفینۂ تہذیب" رکھنے کی تھی، مگر تہذیب پر اتفاق رائے ہوا، رسالے کے لیے عیشؔ نے ہزاروں روپے خرچ کر ڈالے، مولوی حامد حسن قادری (متوفی ۱۹۶۴)، عابد حسین اوجؔ (متوفی ۲۳-۱۹۲۲)، امیر اللہ تسلیم (متوفی ۱۹۱۱)، شبیر علی خاں شبیر (متوفی ۱۹۳۱)، محمود علی خاں محمودؔ (متوفی ۱۹۳۴) خصوصی معاونین تھے (۲)۔

رسالہ تہذیب متعدد اصحاب قلم کو پردۂ گم نامی سے روشنی میں لاتا ہے، سرکاری کتب خانے کے رجسٹرار محمود علی خاں عرشی (۳) ۱۹۰۷ء میں تہذیب کے قلمی و مالی معاون بنائے گئے، جنہوں

(۱) تذکرہ کاملان رام پور، جلد دوم، مرتبہ عابد رضا بیدار، مطبوعہ پٹنہ۔ (۲) تہذیب، ۱۹۲۳ء۔ (۳) ایضاً۔

☆ رام پور رضا لائبریری، رام پور۔

نے رسالے میں "شرح نہج البلاغہ" کی اشاعت کا اعلان کیا، دوسرا اعلان "پشتو اور اردو" پر مضمون لکھنے کا کیا تھا، مگر نہج البلاغہ کا مسودہ نہیں مل سکا (دسمبر ۱۹۰۶ء)، مگر ان کے اچانک حیدرآباد چلے جانے کی وجہ سے رسالے کا وجود خطرے میں پڑ گیا، عیشؔ نے تہذیب کو دل چسپ بنانے کے لیے "طالب حق" اور "بندۂ خدا" کے فرضی ناموں سے "مادہ ازلی قدیم ہے یا نہیں" کی بحث چھیڑی، مولوی شاداں بلگرامی (شمارہ فروری مارچ ۱۹۰۷) مثنوی گل زار نسیم و سحر البیان کی بحث شائع کی مگر رسالہ مقبول نہ ہو سکا، پھر فرزند عزیز اللہ خاں کو ادارہ میں شامل کیا گیا۔

حامد حسن قادری نے "داستان تاریخ اردو" میں لکھا ہے کہ نیرنگ کے بانی عزیز تھے لیکن نیرنگ بھی تہذیب کے سال بھر بند رہنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں عیشؔ ہی نے جاری کیا، اس وقت عزیز کان پور میں فارسی کے استاد تھے پھر نیرنگ ۱۹۲۳ء میں عیشؔ کی وفات پر بند ہو گیا، عزیز ملازمت سے مستعفی ہو کر والد کی اسامی محافظ خانہ اور پھر رجسٹری آفس میں ملازم ہوئے، اس کے ساتھ ہی نیرنگ کو از سرِ نو دو سال بعد جاری کیا، مگر اپنی طویل علالت کے باعث اپنے نوجوان دوست اور مشہور شاعر مصنف ڈراما نگار عشرت رحمانی کے سپرد کر دیا۔

عہد عزیزی میں خصوصی معاون صفی لکھنوی (م ۱۹۵۰)، جعفر علی خاں اثر لکھنوی (م ۱۹۶۷)، محشر لکھنوی (م ۱۹۳۵)، راز چاند پوری (م ۱۹۶۹)، جگر بریلوی (م ۱۹۷۶)، دتاتریہ کیفی (م ۱۹۵۵)، تمکین کاظمی (م ۱۹۶۱) شامل تھے اور نواب احمد یار خاں دولتانہ رئیس پنجاب سرپرست رسالہ تھے۔

جنوری ۱۹۳۰ء کے اہم لکھنے والوں میں ابو طاہر مجددی (م ۱۹۵۸)، شوق قدوائی (م ۱۹۲۵) کے علاوہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی (م ۱۹۸۱) (۱) جو پہلے عرشی نعمانی کے نام سے مشہور تھے، شامل تھے، خاص طور پر محمد یعقوب صدر اسمبلی دہلی کا مضمون "ایک لٹریری پیش گوئی" ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

"مولانا آزاد کے بہ قول مشترکہ زبان کا خیال ۱۱۹۳ء میں پیدا ہوا، دہلی و اجمیر کا راجہ پرتھوی راج غوری کے مقابلے میں مارا گیا تو چندر بردائی نامی شاعر

(۱) سنین وفات بشارت فروغ کی مشاہیر روہیل کھنڈ سے ماخوذ ہیں۔

نے اس واقعہ کو نظم کیا اور فارسی و عربی الفاظ اس میں شامل کیے، ولیم ہنٹر نے اسے
ہندی کی سب سے قدیم نظم کہا ہے''۔

مولوی محمد یعقوب نے ہندی کی پیدایش، نشو ونما کو اردو پر منطبق کیا ہے، ہندوستانی
عربی فارسی اشتراک سے جو زبان بنی وہ اردو ہندی دونوں کی مشترکہ شکل تھی، مثلاً ملک محمد جائسی
کی پدماوت میں مخلوط زبان تھی جو رفتہ رفتہ لشکری اور پھر اردو کہلانے لگی۔

جنوری ۱۹۳۰ء میں ہی مولانا محمد علی جوہر کے بھائی ذوالفقار علی خاں گوہر (م ۱۹۵۴ء) کا
مضمون، اصغر تلمذ مومن (م ۱۸۵۷ء)، محمد علی خاں اثر (م ۱۹۶۳ء) کا ''زبان اردو کا اثر مخارج الفاظ پر''
شائع ہوا، ابو طاہر مجددی، عیش رام پوری، مہر کی نگارشات کے علاوہ جانشین داغ محمود رام پوری
(م ۱۹۲۴ء) کا شکایتی مراسلہ ہے، جس میں ۱۹۱۹ء کے شمارے میں ان کے کلام کا سرقہ چھاپنے کی شکایت
ہے، اگست ۱۹۲۹ء میں رام پور کے مشہور ناول نگار قیسی رام پوری (م ۱۹۷۴ء) جو بعد میں قیسی اجمیر
کہلائے اور پھر ترک وطن کر گئے تھے) کا افسانہ ''جرم کم سنی'' شائع ہوا، جولائی میں قیسی کی تصویر بھی
چھپی، ستمبر میں مولوی عظیم الدین میسوری نے ''ہندوؤں کی اسلامی تعلیمات'' سے مطابقت رکھنے والی
باتیں جمع کی ہیں، عرصہ دراز کے بعد اسی موضوع پر نئے دلائل و براہین کے ساتھ علامہ شمس نوید عثمانی
دیوبندی ثم رام پوری (م ۱۹۹۳ء) نے قلم اٹھایا۔ (دیکھیے ''اگر اب بھی نہ جاگے تو'' مرتبہ عبداللہ طارق)

اکتوبر ۱۹۲۹ء میں جگت موہن لعل رواں (م ۱۹۳۴ء) کی رباعیاں اور شمارہ نمبر ۲ میں
شوق قدوائی کا مکتوب جس میں سید محمد نقی کا نام بہ حیثیت نگراں دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا ہے، اپنے
مکتوب میں شوق نے محمد ذکی مرادآبادی کی غزل کا شعر ؎

آؤ سمجھائیں تمہیں روح نکلنے کے رموز   بے زبانی میں یہیں شرح وفا ہوتی ہے

بہت پسند کیا ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل کی اشاعت ذکی کی وفات (۱۸۶۴ء) کے بعد منتخب
کلام کے تحت کی گئی تھی، خود عزیز نے ساغر نظامی کے شعر ؎

وہ سامعہ نوازی، وہ زمزمہ چکانی   ساغر برس رہے تھے ہر جنبش نظر سے

کو پسندیدہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ رسالہ ''حسن ادب'' لکھنؤ میں حامد علی خاں جلیل مانک
پوری (م ۱۹۴۶ء) کے ایک شعر کی توصیف کی مگر شعر کا مضمون ناسخ سے ٹکرا گیا تھا:

جلیل: کیا کیا گل رخسار یہ دامن میں لیے ہے   آئینہ محفل ہے کہ گل چیں ہے چمن کا
ناسخ: گلفشاں عکس ہوا کسی رخ رنگیں کا   کہ ہے آئینے میں عالم سبد گل چیں کا

عزیز کی زندگی ہی میں عشرت رحمانی عملی طور پر نیرنگ کے کرتا دھرتا ہو گئے تھے مگر جب
ان کی ملازمت دہلی کے کسی اسکول میں ہوگئی تو وہ مچھلی بازار دہلی سے رسالہ شائع کرنے لگے،
حالانکہ انہیں فلم انڈسٹری کا بھی سہارا لینا پڑا مگر دہلی کے ادبی حلقوں سے حوصلہ افزائی بھی ہوئی،
حضرت خواجہ حسن نظامی (م ۱۹۵۵ء) نے ''محبت کے نوشتے'' کے زیر عنوان لکھا:

''مجھے یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ جناب عشرت رحمانی الحبوبی
صاحب کی ادارت میں جو ادبی رسالہ نیرنگ شائع ہوتا تھا، ریاست رام پور سے
منتقل ہوکر اب دہلی سے جاری کیا گیا ہے اور اس کا ایک خاص نمبر بھی شائع
ہونے والا ہے، رسالے کا نام نیرنگ ہے اور ایک انقلاب اس میں پوشیدہ ہے،
اس لیے یقین ہے کہ رام پور سے دہلی آنے کے بعد دوسرا انقلاب ترقی کا ہوگا
اور یہ رسالہ دہلی میں بہت جلد کامیاب ہوکر بام عروج تک پہونچ جائے گا،
اہل دہلی اپنے کم سن مہمان کا دلی خلوص کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں''۔

''خواجہ حسن نظامی''

اس پر مدیر کا نوٹ ہے، ان نیرنگ نوازیوں پر نیرنگ نازاں ہے۔

اس کے علاوہ مولانا محمد واحدی، مولانا تاجور، مولانا ناصر نذیر فراق، مولانا عزیز حسن
بقائی، مولوی عبدالمجید کے پیغامات بھی شائع ہوئے، جب تک عزیز اللہ خاں حیات رہے ان کی
ملکیت قایم رکھی گئی، ۱۹۳۰ء میں نواب حامد علی خاں کی وفات کی خبر خصوصیت کے ساتھ شائع
ہوئی، اس عہد میں صفی لکھنوی، سہا مجددی، امجد حیدرآبادی، محوی صدیقی، مرزا فرحت اللہ بیگ،
آشفتہ لکھنوی، ظفر قریشی، ثاقب کان پوری، مولوی شمس الغنی رام پوری، مولوی عبدالعلی رام پوری،
سعیدی، ہشیر عکس، مولانا عرشی رام پوری اور مولوی سید احمد قادری کی تحریریں تزک و احتشام سے
شائع ہوئیں، مارچ ۱۹۲۹ء میں سید احمد قادری کے مضمون تذکرہ طبقات الشعرا میں قدرت اللہ
شوق کا وطن مولود موضع موی ضلع سنبھل لکھا گیا ہے، بہ قول نساخ وہ آخر عمر میں رام پور آ گئے تھے

اور یہیں ان کا انتقال و مدفن بنا، نیرنگ کے سالگرہ نمبر میں عرشی رام پوری کی تحقیق ''میرزا غالب کے غیر مطبوعہ کلام۔تبرکات غالب'' پر مدیر کا نوٹ ہے:

''یہ غزل غالب کے موجود کسی دیوان میں نہیں ہے، نواب الٰہی بخش خاں معروف کے قلمی نسخہ میں میرزا غالب کی ایک تضمین پائی گئی جو رام پور کے کتب خانہ سرکار عالیہ میں محفوظ ہے، اس سلسلے میں ہم مولانا عرشی صاحب کے ممنون ہیں، غزل مندرجہ ذیل ہے:

اپنا احوال دل زار کہوں یا نہ کہوں ہے حیا مانع اظہار کہوں یا نہ کہوں
نہیں کرنے میں تقریر ادب سے باہر میں بھی ہوں محرم اسرار کہوں یا نہ کہوں
شکر سمجھو اسے یا کوئی شکایت سمجھو اپنی ہستی سے ہوں بیزار کہوں یا نہ کہوں
اپنے دل ہی سے احوال گرفتاری دل جب نہ پاؤں کوئی غم خوار کہوں یا نہ کہوں
دل کے ہاتھوں سے کہ ہے دشمن جانی میرا ہوں اک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں

آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے تو اسد
حسب حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں

(دیوان معروف کامل،ص ۱۸۴،رضا)

خاص نمبر جنوری ۱۹۳۵ سے رسالے کا نیا نام ''نیرنگستان'' رکھا گیا جیسے نیاز فتح پوری کا نگار، نگارستان ہوا تھا، خاص نمبر کا اداریہ منشی پریم چند کے اردو ہندی قضیے میں مخالفانہ نظریات پر ہے، جنہوں نے ہندی پرچارنی سبھا کے صدر کی حیثیت سے صدارتی تقریر میں کہا تھا کہ:

''یہ لفظ (ہندی) خود مسلمانوں کا ایجاد کردہ ہے، پچاس سال پہلے مسلمان بھی اردو کو ہندی ہی کہتے تھے، اب ہندی کو قدرتی نام کیوں نہ خیال کیا جائے''۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے عشرت رحمانی نے لکھا کہ اگر منشائے دلی مشترکہ زبان ایجاد کرنا ہے تو ہندی کے بہی خواہ اردو کی مخالفت پر کیوں تلے ہوئے ہیں کہ رسم الخط دیوناگری ہو، آپ یہ کہتے ہیں کہ ملک کا نام اردوستان کے بجائے ہندوستان ہے، منشی جی نے اعتراف کیا ہے کہ ہندی کو مسلم بادشاہوں نے نوازا اور مسلمانوں نے ہندی نظموں میں طبع آزمائی کی، اس سے

ثابت ہے کہ مسلمانوں نے ہندی کی مخالفت نہیں کی، منشی جی کہتے ہیں کہ قوم سے محبت کرنے والا لفظوں سے نہیں لڑتا لیکن وہ ان کے ہواخواہ لفظوں سے لڑ رہے ہیں۔

اسی شمارہ میں وحشت کلکتوی، احسن مارہروی، کیفی دہلوی، عشرت لکھنوی، اکبر حیدری، راز چاند پوری کے شاعرانہ کمالات و سخن فہمی کا اعتراف کیا گیا ہے، گل کدہ کے عنوان سے غالب اکبر و اقبال کے بارے میں عزیز لکھنوی، احسان دانش، مہر اور وقار عظیم کی تحریریں پیش کی گئی ہیں، سید ابن علی مدیر نیر اعظم مراد آباد کا روزنامچہ سفر بصرہ، کربلا، بغداد و مکہ بھی دل چسپی کا حامل ہے، نیرنگ ستمبر ۱۹۳۱ء میں غلام ناصر خاں نگار کا افسانہ محبت کے تین شکار اور ستمبر و نومبر میں رحمت نبی خاں رام پوری کا مضمون'' بیت المقدس پر ہلال و صلیب کی معرکہ آرائی'' شائع ہوا۔

اس عہد میں جوش ملیح آبادی، علی عباس حسینی، تاجور نجیب آبادی، وحشت کلکتوی، مہر محمد خاں، شہاب مالیرکوٹلوی، احسن مارہروی، جگر مراد آبادی، کوثر چاند پوری، ایم اسلم، باقی غازی پوری، شیام موہن جگر، سلطان حیدر جوش، میرزا یگانہ چنگیزی، اعظم کریوی، مولانا حسرت موہانی، روش صدیقی، آغا قزلباش جیسے مایہ ناز اہل قلم اس رسالے میں لکھ رہے تھے، اس کے باوجود نیرنگستان کی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے، اس لیے عشرت رحمانی کو ترک وطن کرنا پڑا اور انہوں نے لاہور سے ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا، کیوں کہ سعید اللہ خاں عیش کے پہلے رسالے کا نام ''تہذیب'' تھا، آج کل رام پور کے ایک اور فرزند محمد ذاکر علی خاں کراچی سے ''تہذیب'' شائع کرتے ہیں اور یہ رسالہ بھی ادبی دنیا میں نہایت وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

❀❀❀❀

اخبار علمیہ

کسی تحریر کو پائیدار اور محفوظ کرنے کے لیے اچھے قسم کا کاغذ اور عمدہ روشنائی ضروری ہے، اس سے کتابیں مدتوں ضائع نہیں ہوتیں، یہ بہت افسوس ناک ہے کہ متعدد مخطوطات اور مطبوعہ کتابیں نذر آب و آتش اور زمانے کی دست برد سے نسیا منسیا ہوجاتی ہیں، تاہم مسلمانوں کی دل چسپ تاریخی کتابیں اب بھی میوزیم، ذاتی کتب خانوں اور ایسی جگہوں میں موجود ہیں مگر عموماً اہل علم کی دسترس سے باہر ہیں، مصر کی شہرۂ آفاق ''الازہر لائبریری'' نے ٹکنالوجی کی مدد سے مسلم اسکالروں کی علمی دریافتوں اور تحقیقی کاوشوں کے تحفظ کا منصوبہ تیار کیا ہے، اس پروجیکٹ کے تحت توقع ہے کہ ۴۲ ہزار قدیم اسلامی مخطوطات اور ایک لاکھ ۲۸ ہزار کتابیں اسکین کر کے عام لوگوں کے مفت استعمال کے لیے انٹرنیٹ پر مہیا کی جائیں گی۔

''ٹیلی گراف'' کی اطلاع کے مطابق فزکس (طبیعیات) کی اطمینان بخش تعلیم کے لیے اساتذہ کی قلت ہے، اسی کے ساتھ یہ افسوس ناک المیہ بھی ہے کہ اکثر معلمین سن رسیدہ ہوچکے ہیں اور ان میں بھی اکثریت ان لوگوں کی ہے جن کی یونی ورسٹی سطح تک کی تعلیم ہی نہیں ہوئی ہے، رپورٹ کے مطابق فزکس کی اعلا سطح کے امتحان میں شامل ہونے والے طلبہ کی تعداد میں ۳۸% کمی آئی ہے اور زیادہ تر طلبہ کمبائن سائنس میں داخلہ لے رہے ہیں تا کہ وہ فزکس کی بھی کسی قدر معمولی تعلیم حاصل کرسکیں اور یہی کم تعلیم یافتہ لوگ اسے پڑھا بھی سکیں، اس رجحان کی بنا پر بعض تجزیہ نگاروں نے متنبہ کیا ہے کہ اس سے طلبہ کے ذہن پر یہ غلط اثر مرتب ہوگا کہ یہ سبجیکٹ بہت دشوار ہے اور اس کا حصول ان کی دست رس میں نہیں علاوہ ازیں نظام تعلیم پر بھی یہ رجحان اثر انداز ہوگا جس کی اصلاح بعد میں بہت مشکل ہوگی، رپورٹ میں یہ بھی تحریر ہے کہ نئے اساتذہ میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہوتی ہے جنہیں بایولوجی سے زیادہ دل چسپی ہے۔

جنوبی افریقہ میں ایک رس دار اور پتیوں سے معری ہوڈیا گورڈنی نام کا ایک درخت ہے جو کیکٹس سے مشابہ ہے لیکن اس کا کیکٹس کی نسل سے واقعتا کوئی تعلق نہیں ہے، اس کی کانٹے دار

شاخیں انسانوں کی انگلیوں کے مانند ہوتی ہیں اور اس کے پھولوں کی رنگت انسانوں کے جسم جیسی ہوتی ہے، اس درخت کے متعلق جنوبی افریقہ کے سائنس دانوں کی رپورٹ ہے کہ اس میں ایسے اجزا کثیر تعداد میں ہوتے ہیں جو موٹاپے کو ختم کرنے اور اسہال کی بیماریوں کے علاج میں بہت موثر ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اس میں P57 سالمہ ہوتی ہے جو گلوکوز کے بالمقابل بدرجہا زیادہ طاقت ور ہے اور اگر کھانا نہ کھا کر صرف اس کے سفوف کا استعمال کیا جائے تو بھی شکم سیری ہوجاتی ہے۔

زمین سے دکھائی دینے والا سب سے تابندہ سیارہ مریخ ہے، اس کی مہم سر کرنے کے لیے ناسا کا سائنسی وفد برابر مستعد رہتا ہے، چنانچہ پہلا وفد ۱۹۷۳ء، دوسرا ۱۹۸۰ء اور تیسرا ۱۹۹۱ء میں روانہ ہوا تھا اور اب اس سے سبک دوش ہوکر وظیفہ یاب ہوچکا ہے، قابل ذکر بات یہ ہے کہ قدیم دیدوں کے ساتھ ساتھ ریاضی دانوں اور ماہرین علم نجوم نے جس مریخ سے اس ارضی مخلوقات کی زندگی کا اٹوٹ رشتہ ثابت کیا ہے، اسی کو مرکزی نقطہ مان کر جدید سائنس نے نظام شمسی میں زندگی کے امکانات کی تلاش کا سلسلہ شروع کیا ہے اور اس کی حقیقت جاننے کے لیے دس قدم آگے اپنی خلائی گاڑی اس کی سطح پر اتار دی ہے اور اب انسان بذات خود اس کی پامالی کی زور شور سے تیاری کررہا ہے، فی الحال مریخ کی پشت پر امریکہ، یورپ کی دو دو اور جاپان کی ایک خلائی گاڑی مریخ شناسی کی مہم میں مصروف ہے، روس کے تین خلائی اسٹیشن اس سے صرف تین دن کی دوری پر واقع ہیں، ان تمام ہی ملکوں کی اس مہم کا مشترک مقصد یہ ہے کہ وہاں ہوا، پانی اور جوہر یعنی ایٹم وغیرہ کے بارے میں یقینی اور حقیقی معلومات حاصل کریں تا کہ مریخ پر آباد ہونے کا ارادہ کرنے والا انسانی گروہ پوری تیاری کے ساتھ وہاں پہنچے، امریکہ نے تو وہاں پر موجود اپنی خلائی گاڑی کے موصول پیغامات کی روشنی میں مریخی سماج سماج بھی بنالیا ہے مگر انتہائی صاحب دولت و ثروت ہی اس میں حصہ لے سکیں گے، تاہم ان میں سے ہر ایک نے ساڑھے دس کروڑ ڈالر دینے کا تحریری معاہدہ کیا ہے، منصوبے کی تحقیقی رپورٹ میں یہ بات بھی درج ہے کہ پہلے ایسی گاڑی بھیجی جائے گی جو واپس آسکے، چھ مہینے کے اس خلائی سفر میں پہلے چوہوں اور کتوں کا قافلہ روانہ کیا جائے گا تا کہ حیوانوں کی زندگی کے بارے میں سمجھا جاسکے۔

ک۔ص اصلاحی

****

وفیات

پروفیسر عبدالحلیم ندوی

افسوس ہے کہ اردو اور عربی زبان کے صاحب علم وقلم پروفیسر عبدالحلیم ندوی ۱۲/ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو دہلی کے اپولو اسپتال میں انتقال فرماگئے انا للہ وانا الیہ راجعون، ان کی تدفین جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں ہوئی، مرحوم کئی سال سے مسلسل علیل ہونے کی بنا پر گوشہ نشین اور موتوا قبل ان تموتوا کی عملی تفسیر ہوگئے تھے۔

پروفیسر عبدالحلیم کا وطن صاحب گنج دیوریا تھا جہاں ۱۹۲۶ء میں ان کی ولادت ہوئی مگر اب دہلی ہی کے ہوگئے تھے، عربی کی اعلا تعلیم کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلما میں داخلہ لیا، وہاں سے فراغت کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ میں عصری تعلیم کی تحصیل کی اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے پی-ایچ-ڈی کی ڈگری لی، پھر قاہرہ یونی ورسٹی سے بھی کسب فیض کیا۔

مصر سے واپسی کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے، پھر سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجز حیدرآباد سے وابستہ ہوئے اور پروفیسر، صدر شعبہ اور فیکلٹی کے ڈین ہوئے، وظیفہ یاب ہونے کے بعد کچھ دنوں جواہر لال نہرو یونی ورسٹی دہلی سے متعلق رہے اور ۱۹۸۳ء میں دمشق یونی ورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر ہوئے اور جامعہ ملیہ دہلی میں پروفیسر ایمرٹس مقرر ہوئے، وہ ایک اچھے اور کامیاب استاد کی حیثیت سے نیک نام اور طلبہ میں مقبول تھے۔

ڈاکٹر سید عابد حسین نے ذاکر انسٹی ٹیوٹ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے سہ ماہی ''اسلام اور عصر جدید'' کے نام سے ایک باوقار علمی رسالہ نکالا تو پروفیسر عبدالحلیم کو اس کا نائب مدیر مقرر کیا، مرحوم کو اردو اور عربی دونوں زبانوں میں تحریر و تقریر کا ملکہ تھا، اردو میں تاریخ ادب عربی کی تین جلدیں لکھیں اور عربی میں ہندوستان کے عربی مدارس پر مراکز التعلیمیۃ العربیۃ فی الہند لکھی، یہ دونوں کتابیں مقبول ہوئیں اور حوالے کے کام آرہی ہیں، عربی میں ان کی تصنیف منہج النویری فی کتابہ نہایۃ الارب فی فنون الادب دمشق سے شائع ہوئی اور اسے بھی حسن قبول نصیب ہوا، ان کی عربی خدمات کے اعتراف میں صدر جمہوریہ ہند نے انہیں صدارتی ایوارڈ سے نوازا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے آمین۔

''ض''

جناب شان الحق حقی

اردو کے بڑے ممتاز شاعر و ادیب، محقق و مترجم اور لغت نویس جناب شان الحق حقی نے ۱۱/ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو کناڈا میں داعی اجل کو لبیک کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم ایک برس سے پھیپھڑے کے کینسر میں مبتلا تھے، ان کی پیدائش ۱۵/ ستمبر ۱۹۱۷ء کو دہلی میں ہوئی، ان کا خاندانی تعلق شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ سے تھا جن کی ذات سے ہندوستان میں علم حدیث کا بڑا فروغ ہوا، علی گڑھ سے انہوں نے بی اے کیا تھا اور دہلی کے سینٹ اسٹیفن کالج سے ۱۹۴۱ء میں انگریزی میں ایم اے کیا، اس کے بعد ''آج کل'' دہلی کے نائب مدیر ہوئے، پھر شملہ میں مترجم کی حیثیت سے کام کیا۔

۱۹۴۷ء میں وہ دہلی سے پاکستان چلے گئے، ۱۹۵۳ء میں لندن سے ذرائع ابلاغ عامہ کا کورس کیا، عرصے تک ترقی اردو بورڈ پاکستان کے اعزازی سکریٹری رہے اور اس کے مجلّے کے شعبہ ادارت سے بھی منسلک رہے۔

دہلی سے تعلق کی بنا پر ان کی تحریریں بھی ڈھلی ہوئی شستہ زبان کا نمونہ تھیں، ان کو ٹکسالی زبان اور محاوروں اور ضرب الامثال پر قدرت کاملہ حاصل تھی، وہ زبان کی صحت کا بڑا خیال رکھتے تھے اور اس کے نوک پلک اور الفاظ کے محل استعمال سے بخوبی واقف تھے، ان کی اس طرح کی تحریروں اور مضامین سے اہل ذوق بہت محظوظ ہوتے تھے۔

نثر و نظم دونوں پر یکساں قدرت تھی، تار پیراہن اور حرف دل رس وغیرہ ان کے شعری مجموعے ہیں، نثر میں افسانہ، ڈرامہ، تنقید، ترجمہ اور لغت نویسی ہر ایک میں اپنے جوہر دکھائے ہیں، بچوں کے ادب سے بھی شغف تھا، ان کے لیے پہیلیوں، کہہ مکرنیوں اور نظموں کی متعدد کتابیں لکھیں، لغت نویسی اور ترجمے میں ان کی خدمات بے مثال ہیں، کئی منظوم ترجمے ان کی یادگار ہیں، ۲۰-۲۵ برس کی عمر میں شیکسپیئر کے ڈرامے انٹونی قلوپطرہ، کوٹلیا کے ارتھ شاستر کے ترجمے کیے، عالمی ادب کی منتخب نظموں اور بھگوت گیتا کے منظوم ترجمے کیے، مرحوم اچھے افسانہ نگار بھی تھے، اپنی ان گوناگوں خدمات اور معیاری ادبی کاموں کی بنا پر حکومت پاکستان نے انہیں تمغۂ قائد اعظم اور ستارۂ امتیاز سے سرفراز کیا۔

حقی صاحب نرم مزاج، خوش اخلاق اور مہمان نواز تھے، تہذیب، شائستگی اور نفاست ان کی فطرت میں رچ بس گئی تھی، اللہ تعالیٰ اردو کے اس مخلص خدمت گزار اور شریف انسان کو اپنی رحمت کاملہ سے نوازے اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل مرحمت فرمائے آمین۔

''ض''

❀❀❀❀

باب الاستفسار و الجواب

علامہ ابن خلکان

مولانا محمد مصطفیٰ قاسمی
سیتامڑھی، بہار

علامہ ابن خلکان کا اصل نام کیا ہے نیز ان کے والد کے نام سے بھی آگاہ کریں، وہ کہاں کے رہنے والے تھے، ابن خلکان لقب کس نے دیا اور اس کی وجہ کیا ہے؟ معلومات بحوالہ کتب فراہم کریں۔

معارف: ابن خلکان کا نام احمد اور والد کا نام محمد بن ابی بکر ہے، شمس الدین ابوالعباس کنیت ہے، یہ ۶۰۸ھ میں پیدا ہوئے، حدیث و فقہ میں اپنے وقت کے کبار علما مثلاً ابن مکرم، موید الطوسی، کمال بن یونس اور ابن شداد سے، موصل و شام میں تحصیل علم کی، بعد میں مصر چلے گئے، عرصے تک وہیں رہے، وہاں نائب قاضی ہوئے، پھر شام میں عہدۂ قضا سپرد ہوا اور قاضی القضاۃ کے نام سے موسوم ہوئے، وہ قضا میں بہت ممتاز تھے۔ (مرأۃ الجنان: ابو محمد عبداللہ بن اسعد بن علی الیافعی الیمنی مکی، ج ۴، ص ۱۹۳)

امام اسنوی نے لکھا ہے کہ خلکان ایک موضع کا نام ہے لیکن ابن عماد حنبلی کی نظر میں یہ وہم ہے، صحیح یہ ہے کہ یہ ان کے اجداد میں کسی کا نام تھا۔ (شذرات الذہب: ابن عماد حنبلی، ج ۵، ص ۳۷۲)

تمام تذکرہ نگاروں نے ابن خلکان کے لقب سے یاد کیا ہے اور خود ابن خلکان نے اپنی کتاب وفیات الاعیان کا آغاز بھی اسی عبارت سے کیا ہے کہ یقول الفقیر الی رحمۃ اللہ شمس الدین ابوالعباس احمد بن محمد بن ابراہیم ابن ابی بکر بن خلکان الشافعی رحمۃ اللہ تعالی، دائرۃ المعارف الاسلامیہ نے اطلاع دی ہے کہ وفیات الاعیان کا ایک قلمی نسخہ بخط مصنف برٹش میوزیم میں موجود ہے۔

ع۔ص

****
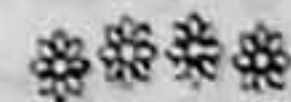
مطبوعات جدیدہ

مکی اسوۂ نبوی ﷺ مسلم اقلیتوں کے مسائل کا حل: از پروفیسر محمد یاسین مظہر صدیقی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۳۲۷، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: اسلامک بک فاؤنڈیشن ۱۷۸۱، حوض سوئی والان، دہلی۔

اقلیت اور اکثریت کے نام کی سیاسی اصطلاح موجودہ دور میں اگر عام ہوئی تو اس کی ایجاد کا سہرا بھی یورپ کے ہی سر ہے، جس نے صرف سائنس ہی میں نہیں فلسفہ اور سماجی علوم میں بھی کثرت سے نئے عنوانوں کی اختراع کی، اصطلاحات کی تشکیل کے بعد ظاہر ہے عملاً ان کے اثرات کا ظہور بھی ہوا اور اب اقلیت و اغلبیت کا مسئلہ قریب ہر ملک کے اہم مسائل میں شمار کیا جاتا ہے اور اس کا سب سے زیادہ اثر امت مسلمہ پر محسوس کیا جاتا ہے حالانکہ اس اہم کتاب کے مصنف کے بقول "گیارہویں صدی عیسوی کے وسط سے سوائے چند طبقات کے مسلمان غالب قوم نہیں رہے تھے لیکن فقہ اسلامی کی رو سے دیکھا جائے تو اس نے اس وقت بھی اور مابعد بھی، صرف حاکم مذہب اور نظام حاکمیت کی ترجمانی کی" اور جب من حیث القوم، نفسیات صرف حکم رانی کی ہو تو محکومی کے مسائل پر نظر کم ہی جا سکتی ہے، فاضل مصنف اس حیثیت سے ممتاز ہیں کہ انہوں نے سیرت نبوی کا مطالعہ ایسے زاویوں سے بھی کیا جن کو عمومی طور پر کم ملحوظ رکھا گیا، فاضل مصنف کا یہ شکوہ اسی کی دلیل ہے کہ "مسلم سیرت نگاروں نے خالص روایتی انداز اختیار کیا، پوری سیرت طیبہ کا اصل تحلیل و تجزیہ نہیں کیا گیا اور مکی دور کا تجزیہ تو انتہائی ناقص ہے"، ممکن ہے اس شکایت کی لے کچھ زیادہ ہی اونچی ہوگئی ہو، کیونکہ سیرت نگاری کا جزوی تجزیاتی پہلو، حالات و واقعات کی ضرورت پر منحصر ہوسکتا ہے، ابن اسحاق و ابن ہشام اور ان کے پیرو سیرت نگاروں کا سابقہ اگر اس ضرورت سے نہیں ہوا تو اس کی بنیاد پر ان کی مساعی کو "محض کورانہ تحریروں" سے تعبیر کرنا شاید درست نہ ہو، البتہ یہ خیال بالکل درست اور بجا ہے کہ مکی دور اقلیت میں مسلمانان عالم کی اس حیثیت کے لیے کامل دستور موجود ہے اور اس قابل قدر کتاب میں اسی دستور کی تشریح اور تفصیل اس طرح موجود ہے کہ مکہ مکرمہ کے کثیر قومی معاشرے، مسلم اقلیت کی تشکیل و تعمیر و ارتقا، نظام مدافعت، دفاعی معاہدوں اور ہجرت پر معقول بحث آگئی ہے اور آخر میں اسلامی ریاست کے قیام

کے بعد مسلم اقلیتوں کے مسائل پر بھی بحث مزید ہے اور خلاصۂ بحث کے طور پر موجودہ زمانے کی مسلم اقلیتوں کے لیے لائحہ عمل بھی اس نیت سے پیش کیا گیا ہے کہ سیرت نبویؐ سے ہدایت حاصل کر کے زندگی گزارنے کا اسلامی طریقہ معلوم ہو جس سے مسلمان اقلیت سے اکثریت میں اور محکوموں سے حکم رانوں میں بدل سکتے ہیں، اس آخری جملے سے فاضل مصنف کی وہی سائیکی بے اختیارانہ سامنے آجاتی ہے جس کا شکوہ وہ دوسرے سیرت نگاروں کے سلسلے میں کر چکے ہیں، اصلاً یہ تمام مباحث خطبات کی شکل میں حیدرآباد دکن میں پیش کیے گئے تھے، تعداد میں یہ آٹھ ہیں اور اس طرح یہ مجموعہ واقعی ہشت پہل ہو گیا ہے، سیرت اور متعلقات سیرت سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے ان تمام مباحث میں بڑے نکتے آگئے ہیں، بنو عبد مناف کے متحدہ خاندان کی تقسیم میں قبائلی رقابت سے زیادہ سیاسی و معاشی مفادات کا دخل تھا، قریش کے اور خاندانوں میں بھی ایسی منافرت کی مثالیں موجود ہیں اور یہ کہ شرک، توحید کی طرح یک جہت عقیدہ نہیں ہے، اس لیے اس کے زیر اثر کوئی سماج متحدہ اکائی نہیں بن سکتا وغیرہ، مکہ مکرمہ کے عرب قبائل کے باب میں کہا گیا کہ ہمیشہ سے قریش کی غالب اکثریت مکہ مکرمہ میں نہیں رہی نہ ان کو سیادت حاصل رہی اور مثال کے طور پر بنو جرہم و بنو خزاعہ کا ذکر ہے ظاہر ہے بنو جرہم کے عزیز حضرت اسماعیلؑ کی نسل شروع سے اکثریت میں کیوں کر آسکتی ہے؟ مکہ کے دوسرے قبائل کو "آفاقی" کہا گیا ہے، اس کی وضاحت کی ضرورت تھی، قریش کے اکابر مشرکین کے بارے میں یہ کہنا کہ دینی سلامت روی اور فکری عبقریت کے باوجود ان کا شرک محض صدیوں کے رواج میں پھنس جانے کا نتیجہ ہے یا یہ کہ ان کی جذباتی طلب، بعثت محمدیؐ کے قریب ایک فعال اور اجتماعی تحریک کی شکل میں بدل گئی تھی یا یہ کہ فطرت صالحہ کا سماجی رویہ تھا، بہر حال محل نظر ہے، بعض احناف قریش کے انفرادی کاموں کو تلاش حق کا "منفی پہلو" قرار دینا بھی وضاحت طلب ہے، قریش مکہ، یہودیوں اور نصرانیوں سے خم کھاتے تھے، اس جملے میں دم کم ہے، ان چند مشکل مقامات کے ماسوا، پوری کتاب تحقیق و تدقیق اور مطالعہ و تجزیہ کا بہترین نمونہ ہے اور خلاصہ کلام بالکل برحق ہے کہ مکی اسلام اور مدنی اسلام کی تفریق دراصل ایک عظیم حکمت الٰہی پر مبنی ہے، آخری خطبہ اسی حکمت الٰہی کی بڑی مؤثر اور دل کش تشریح ہے، یہ مجموعہ خطبات بے شبہ سیرت نبویؐ کے مطالعہ میں جدت اور ندرت کا حامل ہے، اس لیے اس کی افادیت بھی مسلم ہے۔

تذکرہ مشائخ غازی پور: از جناب عبدالرحمان صدیقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ

وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۵۰۸، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: مدرسہ فیض القرآن، محمد آباد غازی پور، یوپی۔

مشرقی یوپی کے مردم خیز علاقوں میں ضلع غازی پور کی خاص اہمیت ہے، اسلامی ہند میں یہ خطہ ہمیشہ مسلم حکم رانوں اور علما و مشائخ کا مرکز توجہ رہا، اس کے نام سے ہی اس کی تاریخ متعین ہو جاتی ہے، محمد بن تغلق کے عہد حکومت میں امیر سید مسعود ملک السادات غازی نے اس علاقہ کو فتح کر کے دریائے گنگا کے کنارے اس شہر کی بنیاد رکھی، اس کتاب میں نوابین اودھ بلکہ انگریزوں کے دور اقتدار تک کی تاریخ بڑی محنت اور تلاش و جستجو کے ساتھ مرتب کی گئی ہے، لائق مصنف نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دور قدیم یعنی گوتم بدھ اور گپت دور کی تاریخی روایات کے آئینے میں اس علاقے کا بڑا خوبصورت چہرہ دکھایا ہے، اصل کتاب تو یہاں کے مشائخ کرام کے حالات پر مشتمل ہے اس میں ملک مردان شاہ سے شاہ محمد نعیم تک سینکڑوں بزرگوں کا تذکرہ ہے، اس طرح غازی پور کی مکمل تاریخ کے علاوہ اس میں صوفیہ و علما حضرات کی پوری تاریخ آگئی ہے، کتاب جس سلیقے سے مرتب کی گئی ہے وہ قابل داد ہے، عربی، فارسی، اردو، ہندی اور انگریزی ماخذ و مراجع کی طویل فہرست ان کی دیدہ ریزی کی غماز ہے، یہ امید بجا ہے کہ یہ تحقیقی کاوش دیدہ وروں کی نگاہ میں مقام حاصل کرے گی، نیز سلاسل صوفیہ اور قرون وسطی کی تاریخ سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے بھی یہ افادیت کا باعث ہوگی، روایتوں کے اخذ و قبول میں اگر احتیاط برتی جاتی اور کتابت کی تصحیح کی جانب توجہ ہوتی تو اور بہتر ہوتا۔

وفیات اعیان الہند: از ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۴۸۸، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ N-80-C ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی ۲۵۔

حیدرآباد دکن کی تاریخ علوم و فنون میں اس کتاب کے فاضل مصنف کا مرتبہ بلند ہے گو شہرت ان کی کم رہی، مولانا دریابادی نے ان کو اپنے رنگ میں سب سے منفرد پایا تو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ان کی دقت نظر اور تحقیقی کاموں کے قائل اس حد تک تھے کہ ان کو ہندوستان کا علمی سرمایہ اور قیمتی متاع قرار دیتے تھے، ڈاکٹر صاحب مرحوم کی ضمائر القرآن کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے، زیر نظر کتاب بھی تاریخ میں ان کی محققانہ کاوش اور دیدہ ریزی کا ایک عمدہ نمونہ ہے جس میں ہندوستان کے حکم رانوں، امرا اور اعیان تاریخ کے سنین وفات کو مستند اور معتبر ماخذ کی مدد سے یکجا کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، دیباچہ میں مولف مرحوم کے لائق صاحب زادے

ڈاکٹر عمر خالدی نے اس کتاب کی ضرورت اور مولف کی مساعی شاقہ اور ان کے طریقہ کار کی تفصیل دے دی ہے، ابجدی ترتیب کے لحاظ سے یہ عظیم الشان تحقیقی کاوش غیر معمولی ہے، تاہم ایسے اشخاص بھی ہیں جن کی تاریخ ان کو نہ مل سکی، ان کے مختصر ذکر کے بعد انہوں نے راجع لکھ کر دوسرے محققین کے لیے بہر حال تحقیق کے دروازے کھلے ہیں مثلاً پہلا نام آتش جان بن بختان بیگ ہے جس کے متعلق یہ لکھا کہ "جان بیگ، آتش جان بن بختان بیگ روز بہانی" تو سین میں راجع لکھ دیا گیا، سن عربی عبارت میں اور عدد اردو میں ہیں، مراجع کا ذکر بھی متصلاً ہے، اس طرح تاریخ کے طالب علموں کے لیے یہ واقعتہً بیش بہا علمی تحفہ ہے۔

پردہ اٹھادوں اگر چہرۂ الفاظ سے: از ڈاکٹر ف-عبدالرحیم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۱۳۴، قیمت ۵۰ روپے، پتہ اسلامک فاؤنڈیشن ٹرسٹ (۷۸) ۱۳۸، پیرامبر ہائی روڈ، چینئی نمبر ۱۲۔

لغت و لسانیات کے باب میں اس مختصر مگر دل چسپ کتاب کے مصنف کا خاص میدان لسانیات ہی ہے، جامعہ ازہر سے اسی موضوع پر انہوں نے ڈاکٹریٹ کی سند پائی، عربی لسانیات میں ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، یہ کتاب گو بہ قول مولف نہ لغت ہے نہ علم لغت پر کوئی مقالہ لیکن بعض الفاظ کے تاریخی مطالعہ کے ذوق نے ان کے قلم سے اس موضوع کی دل چسپی میں اضافہ ضرور کیا ہے، الفاظ کے اندر قوموں کی تاریخ پنہاں ہوتی ہے اور یہ لوگوں کے رسم رواج اور عقائد و تخیلات کی آئینہ داری بھی کرتے ہیں، اس احساس کے ساتھ الفاظ کا مطالعہ موضوع کی دل چسپی کا ضامن ہے، پہلے لفظ آرنج سے ہی اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزی کا ORANGE اصلاً فارسی نارنگ ہے، عربی میں نارنج بنا، عربی سے ہسپانوی میں NARANGA بن کر داخل ہوا، پرتگالی میں نون، لام سے بدلا تو LARANGA ہوا، جدید یونانی میں NARANJI ہوا، اطالیہ پہنچا تو نون غائب ہو کر ARANCIA کی شکل میں ظاہر ہوا، فرنچ میں A کی جگہ O کی گولائی نے لے لی، اس کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما تھا کہ لاطینی لفظ OR بہ معنی سونا جوڑ دیا جائے کہ اس کا رنگ سونے کا رنگ ہے اور فرانس کی کھٹی میٹھی کوشش انگریزی کو بھا گئی، یہی رنگ اور الفاظ کا بھی ہے، بغداد بہ معنی خداداد کی تشریح میں کہا گیا کہ قدیم فارسی میں بغ اور بگ خدا کے معنوں میں ہے، سنسکرت میں بھگوت اور ہندی میں بھگوان ہے، لسانیات سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے اس کتاب کا ہر صفحہ دل کش بھی ہے اور معلومات سے لبریز بھی۔

ع-ص